هٰذا بلاغ للناس

جنوری ۶۹ ۲/۱۰

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

دارالعلوم کراچی کا ترجمان

مدیر انتظامی	مدیر اعلیٰ
خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری	محمد تقی عثمانی

شوال المکرم ۱۳۸۸ھ	جلد ۲
جنوری ۱۹۶۹ء	شمارہ ۱۰

فی پرچہ : ۵۶ پیسے ——— سالانہ ۱ ۶ روپے

غیر ممالک سے : ایک پونڈ سالانہ ——— ہوائی ڈاک سے : ۲ پونڈ سالانہ

ڈاک کا پتہ ——— ماہنامہ "البلاغ" دارالعلوم کراچی ۱۴ فون ۴۸۱۱۷

ہندوستانی خریدار مندرجہ ذیل پتہ پر چندہ ارسال فرما کر ڈاک خانہ کی رسید ہمیں بھیجدیں
رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا

مولانا ظہور الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

وطن کی محبّت اور عصبیّت

حمد و ستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

زمین کے جس خطے کو انسان اپنا وطن سمجھتا ہے، اس کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ کا پیدا ہو جانا بلاشبہ انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے، اور اس تقاضے سے کسی حال صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے، جہاں اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، جہاں وہ بچپن کی شوخیوں اور جوانی کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، جس جگہ پہلی بار زندگی کے مختلف روپ اس کے سامنے آتے ہیں، اس جگہ سے اسے ایک خاص اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان اُس سرزمین سے، وہاں کے بسنے والوں سے، اس کی زبان سے یہاں تک کہ اس کے گلی کوچوں اور در و دیوار سے محبت کرنے لگتا ہے، اور بہت شاذ و نادر ہوتے ہیں وہ لوگ جن کا دل اس محبت سے یکسر خالی ہو۔

وطن کی محبت اگر صرف اس حد تک ہو تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ اسلام نے بھی اس فطری محبت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، حدیث میں ہے کہ مدینۂ طیبہ کو وطن قرار دینے کے بعد جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپس تشریف لاتے اور دور سے جبلِ اُحد نظر آتا تو آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ:

ھٰذا جبلٌ یُحِبُّنا ونُحِبُّہٗ

یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں

لیکن اگر یہی محبت اپنی معقول حدود سے تجاوز کر جائے، اور اس کی وجہ سے انسان وطن کی ہر چیز کو "اپنی" اور باہر کی ہر چیز کو "پرائی" سمجھنے لگے تو اسی کا نام "عصبیّت" ہے اور اس سے اسلام شدید نفرت کرتا ہے، گویا اسلام میں وطن کی طبعی محبت کا تو پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ اسے اجتماعی وحدت کی بنیاد قرار دیتا ہے، تو وہ اس کے

نزدیک دوستی اور دشمنی یا محبت اور نفرت کا معیار ہے، نہ اس کی بنا پر اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کے پیشِ نظر حق و ناحق کے فیصلے ہو سکتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر آپ وطن سے باہر کسی مقام پر ہوں، اور وہاں آپ کو اپنے وطن کا کوئی آدمی نظر آ جائے تو طبعی بات ہے کہ آپ اسے دیکھ کر خوشی محسوس کریں گے، اس سے باتیں کرنے اور وطن کے حالات معلوم کرنے میں آپ کو لطف آئے گا، یہ وطن کے ساتھ آپ کی فطری محبت کا اثر ہے اور یہ بات اسلام کی نظر میں قابلِ اعتراض نہیں لیکن اگر کل کو آپ کا وہی ہم وطن کسی مقامی آدمی سے اُلجھ پڑے اور آپ حق و ناحق کو دیکھے بغیر صرف اس بنا پر اس کا ساتھ دینے لگیں کہ وہ آپ کا ہم وطن ہے، تو یہ خالص عصبیت ہے، اور اسلام اس کا کسی طرح روادار نہیں۔

اسی طرح اگر آپ اپنے کسی ہم وطن کو حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تو یہ وطن کے ساتھ آپ کی طبعی محبت کا نتیجہ ہے جس پر اسلام کوئی قدغن نہیں لگاتا، لیکن اگر کسی حکومت کے ساتھ آپ محض اس بنا پر تعاون نہیں کرتے کہ اس کی باگ ڈور آپ کے ہموطن کے ہاتھ میں نہیں ہے، یا آپ کسی آدمی کو محض اس لئے حکومت کا کوئی عہدہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے وطن کا رہنے والا ہے، حالانکہ اس منصب کے لئے باہر کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہیں، تو یہ نری عصبیت ہے اور اسلام اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مذکر اور ایک مؤنث سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں کی شکل دی، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوب کھول کر یہ حقیقت بیان فرمادی ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے درمیان رنگ و نسل اور زبان و وطن کی جو تفریق کی گئی ہے اس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے کی ٹھیک ٹھیک شناخت کر سکیں۔ رہا جہاں تک عزت و ذلت اور بڑائی چھوٹائی کا تعلق ہے، اس کی بنیاد تمامتر انسان کے ذاتی اعمال و اوصاف پر ہے، جو اللہ سے زیادہ ڈرتا اور اس کے احکام کی زیادہ پیروی کرتا ہے وہ زیادہ عزت والا ہے، خواہ کسی وطن کسی قبیلے کا ہو؛ اور جو شخص اس معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے وہ عزت و شرف سے محروم ہے، خواہ کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔

عصبیت کا مزاج قرآن کریم کی اس تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اس کی نگاہ میں غیر قوم، یا غیر وطن کا آدمی ایک مہمان کی حیثیت سے تو اچھے سے اچھے سلوک کا مستحق ہو سکتا ہے، لیکن اُسے "اپنا" کسی حال نہیں سمجھا جا سکتا، وہ علم و فضل کے اعتبار سے خواہ کتنے مقام بلند پر فائز ہو، اخلاق و کردار کے لحاظ سے خواہ کتنا اونچا مقام رکھتا ہو، جسمانی اور فکری صلاحیتوں سے خواہ کتنا مالا مال ہو، لیکن "عصبیت" اسے یہ حق دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے کہ وہ قوم و وطن کے لوگوں میں رہ کر ان سے زیادہ عزت کا مقام حاصل کرے، زندگی کے مسائل میں ان کا رہنما بنے یا ان پر کسی بھی درجے میں حکمرانی کر سکے۔

یہی وہ "جاہلی عصبیت" ہے جس کے خلاف اسلام نے روزِ اول سے جہاد کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بار بار اس غیر انسانی جذبے کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی، اور اس کوشش میں اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ عرب کے بسنے والوں نے ایک طرف حبشہ کے بلال رض، روم کے صہیب رض اور فارس کے سلمان رض کو آگے بڑھ کر گلے لگایا، اور دوسری طرف اپنی قوم و وطن کے ابوجہل و ابولہب کے خلاف تلوار لیکر نکلے، اور عملاً اس بات کا اعلان کر دیا کہ جو خدا کا دوست ہے وہ ہمارا ہے، خواہ کسی ملک و قوم کی طرف منسوب ہو، اور جو خدا کا دشمن ہے وہ ہمارا نہیں ہے، خواہ گوشت پوست کے اعتبار سے وہ ہم سے کتنا قریبی رشتہ رکھتا ہو۔

فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:

"معشر قریش! إن الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالآباء"

"قریش کے لوگو! اللہ نے تم کو جاہلیت کی جھوٹی نخوت سے نجات دیدی ہے، اور باپ دادا کی بنیاد پر بڑائی جتلانے کا دستور ختم کر دیا ہے۔"

اور حجۃ الوداع کے خطبے میں ایک لاکھ سے زائد عربی النسل صحابہ کرام رض کے مجمع کے سامنے آپ نے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:

ایها الناس إن ربكم واحد وان أباكم واحد، كلكم لآدم وآدم من تراب۔ اكرمكم عند الله اتقاكم وليس لعربي على عجمي فضل الا بالتقوى، الا كل شيئ من أمر الجاهلية تحت قدمي موضوع۔

اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے، اور تم سب کا باپ ایک ہے، تم سب آدم کے بیٹے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے، تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے، کان کھول کر سن لو کہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پاؤں تلے روندی گئی ہیں۔"

قرآن و سنت کی ان واضح ہدایات کے بعد یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان رکھنے والا کوئی مسلمان جاہلیت کی اس جھوٹی نخوت کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دے گا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاک میں ملا یا تھا، لیکن خدا جانے کتنی تیرہ و تار گمراہیاں ابھی ہماری قسمت میں ہیں کہ آج قرآن و سنت ہی کے نام لیوا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جاہلیت کی ان متعفن نشانیوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ "عصبیت" کے وہ آدم خور بُت جنھیں اسلام نے ایک ایک کر کے پیوند زمین کیا تھا، آج اسلام کو ماننے والے انہی بتوں کو پھر سے کھڑا کر رہے ہیں اور مسلمان کہلانے والوں کا ایک انبوہ ہے جو پوری تقدیس و احترام کے ساتھ انہیں سینے سے لگا رہا ہے ——— کچھ عرصہ پہلے تک ہمیں اپنے بعض بھائیوں سے یہ شکوہ تھا کہ وہ فرعون کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن ان گنہگار آنکھوں کو یہ منظر بھی دیکھنا تھا کہ اُس ملک میں جس کا خمیر ہی اسلام کے نام سے اٹھا ہے کہنے والے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ رہے ہیں کہ "راجہ داہر ہمارا ہیرو ہے اور محمد بن قاسم ایک لٹیرا تھا" ——— تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

"مہا جئے سندھ" کی جو تحریک آجکل سابق صوبہ سندھ کے علاقے میں چلی ہے، اگر وہ صرف وطن کی طبعی محبت کی حد تک محدود ہو

اور "جئے سندھ" کے نعرے کا مطلب محض ایک دعا ہو تو ہم ہزار بار اس نعرے سے ہم آواز ہونے کو اپنی سعادت سمجھیں گے، جو دل سے ہماری دعا ہے کہ یہ خطہ جئے، قیامت تک جئے؛ پھلے پھولے اور خوش حال ہو کر جئے۔ لیکن جب اس نعرے کے پیچھے عصبیت کا وہ بدبو دار ذہن کام کر رہا ہو جو محمد بن قاسم جیسے فخر انسانیت رہنما سے نفرت کرنا اور راجہ داہر جیسے ننگ انسانیت دیوانستہ ادے محبت کرنا سکھاتا ہے، تو آخر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کی بنیاد میں خلوص نیت کا کوئی چھینٹا بھی پڑا ہے؟

ایک زمانہ تو وہ تھا جب خود راجہ داہر کے ہم مذہب محمد بن قاسم کو اپنا ہیرو قرار دے کر اس پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیا کرتے تھے، اور اس کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، اور چشم فلک آج یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ محمد بن قاسم کے ہم مذہب اسے لیٹرا قرار دے کر راجہ داہر کی قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

ان کی اس انسانیت سوز حرکت سے محمد بن قاسم کی عظمتوں میں تو ذرہ برابر کمی نہیں آتی، کہنے والے کچھ کہا کریں ان کے کہنے سے تاریخ عالم کے اس مایۂ ناز کردار پر کوئی حرف نہیں آتا، اگر اس کائنات میں حق و صداقت کا لفظ کوئی معنی رکھتا ہے تو انسانیت کا ضمیر اس کی بے داغ اور قابل رشک جوانی پر ابدالآباد تک سلام بھیجے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نعرہ بلند کرنے والے خود اپنے وطن، اپنے خطے اور اپنی سرزمین کے ساتھ کیا انصاف کر رہے ہیں؟ سندھ کے خطے نے ماضی میں علم و دین کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، اس کی تاریخ علم و فضل اور ورع و تقوی کی عظیم شخصیتوں سے مالا مال رہی ہے، اور انہی شخصیتوں کی وجہ سے اس خطے کو پورے عالم اسلام میں عزت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیا اب راجہ داہر کو اپنا ہیرو قرار دینے والے حضرات یہ چاہتے ہیں کہ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک پورا عالم اسلام یہ سمجھ بیٹھے کہ سندھ کا یہ مردم خیز خطہ پھر سے راجہ داہر کے نام لیواؤں کا مرکز بن گیا ہے؟ اور اب یہاں محمد بن قاسم کے دوست نہیں، دشمن بستے ہیں؟ اگر خدا نخواستہ ان کی اس تحریک سے یہ تصور ذہنوں میں قائم ہو گیا تو کیا عالم اسلام میں مسلمانوں کے اس محبوب خطے کا کوئی ادنی وقار باقی رہ سکے گا؟ عالم اسلام تو پھر مسلمان ہے، ہمیں تو یقین ہے کہ یہ نعرہ دنیا کے جس گوشے میں پہنچے گا، اگر وہاں عدل و انصاف کی کوئی پرچھائیں پڑی ہے، تو اس نعرے کی مذمت ہی کی جائے گی۔ کیا یہی وہ انصاف ہے جو یہ لوگ سندھ کے خطے کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ علاقائی عصبیت کے یہ افسوس ناک نعرے، خواہ جئے سندھ کی شکل میں ہوں یا پختونستان کی شکل میں، ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر کوئی علمی تبصرہ کیا جائے یا ان کی تردید میں دلائل پیش کئے جائیں، لیکن ہمارے زمانے کا نوجوان اس قدر مظلوم ہو چکا ہے کہ اس کو جوش میں لانے کے لئے بس ایک خوش آواز نعرہ چاہئے۔ اگر اس نعرے میں کوئی ادنی دلکشی ہے تو اس کی ہلاکت آفرینی سے بچانے کے لئے اس کو دی جانے والی تعلیم اس کی کوئی مدد نہیں کرتی۔ علاقائی عصبیت کی تحریک بھی چونکہ وطن کی محبت کے نام پر اٹھی ہے، اس لئے بہت سے سادہ لوح نوجوان اس کے پیچھے بھی چل پڑے ہیں، اور تعلیم تو انھیں ایسی دی ہی نہیں گئی کہ وہ اس کے عواقب و نتائج کو سوچ سکیں۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے سابق صوبہ سندھ کی ایک طالبہ کا ایک خط ملاحظہ فرمائیے۔ جو روزنامہ حریت کراچی میں شائع ہوا ہے، یہ محترمہ اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"راجہ داہر ایک سندھی تھا، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہمارا ہیرو ہے..... وقت آنے پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم سندھی محمد بن قاسم پر لعنت بھیجتے ہیں، مذہب پر لعنت بھیجتے ہیں، شاہ لطیف کو سلام کرتے ہیں، جی ایم سید کو سلام کرتے ہیں، سندھ کی عظمت اسلام سے نہیں، موہن جو ڈارو سے ہے، لاکھوں اسلام اس پر قربان ہو جائیں، ہمارا نعرہ ہے مرسوں مرسوں پر سندھ نہ ڈیسوں، ہم لڑکیوں نے یہ طے کیا ہے کہ اپنے بچوں کے نام داہر، ہیموں کالانی، شیخ ایاز اور ہوشو کے نام پر رکھیں گے"

(حریت میگزین ۸ نومبر ۱۹۶۸ء)

اور ایک اور محترمہ لکھتی ہیں:

"وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں، یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے سندھ کی عظمت سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں، ستارہ موہن جو ڈارو، کوٹ ڈیجان کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے"

ان خطوط کو پڑھ کر افسوس کا جتنا چاہے اظہار کر لیجئے، اور اس جیسی تحریریں لکھنے والوں کو جس برے لقب سے چاہیں یاد کر لیجئے، لیکن کیا اصل قصور اس مغربی نظام تعلیم کا نہیں ہے جسے اب تک ہم نے نوجوانوں کے سروں پر لاد رکھا ہے؟ ہماری نگاہ میں اس ذہنیت کی سب سے بڑی ذمہ داری اس تعلیم پر عائد ہوتی ہے جو نوجوانوں کو اب بھی دی جا رہی ہے، اور جس کی موجودگی میں اسلامی مزاج و مذاق کے لئے ان کے دل و دماغ کا ہر دروازہ بند ہے۔ "اسلامیات" کے گھنٹے میں اسلام کی برتری کے چند کھوکھلے الفاظ وہ خواہ کتنی مرتبہ رٹتے ہوں، لیکن دوسرے تمام گھنٹوں میں ان کی رگ و پے کے اندر تو مغرب کے وہی نظریات سماتے ہیں جنکی رو سے انسان کی جنم بھومی اس کے عقیدے اور اس کی فکر پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

اگر آپ موجودہ نصاب تعلیم کا ٹھنڈے دل کے ساتھ جائزہ لیں تو قومیت کا مغربی تصور اس کی رگ رگ میں بسا ہوا نظر آئیگا، اور جب تک یہ صورت حال برقرار ہے، عصبیت کی کوئی آواز تعجب خیز نہ ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنوں کو عصبیت کے زہریلے جراثیم سے پاک کرنے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نصاب تعلیم پر پوری سنجیدگی کے ساتھ نظر ثانی کر کے اسلامی قومیت کا وہ تصور طلبا کو گھٹی میں پلایا جائے جس کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا۔

عصبیت کے پھلنے پھولنے کا دوسرا سبب ہماری ایک اور زبردست حماقت ہے، اور وہ یہ کہ ہم اب تک موہن جو ڈارو، کوٹ ڈیجی، ہڑپہ، ٹیکسلا اور تخت بائی کو اپنی تہذیب و ثقافت کے مراکز کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں، خدا جانے اس میں سادہ لوحی کا دخل ہے یا کسی سازش کا، کہ اب یہ آثار قدیمہ "پاکستانی ثقافت" کے آئینہ دار سمجھے جانے لگے ہیں۔ اور عام طور سے ان کا تذکرہ اسی عقیدت و محبت کے ساتھ کیا جانے لگا ہے گویا یہ ہماری تہذیبی عظمتوں کا اصل سبب ہے اور ہمارے ماضی کی یادگار ہیں۔ لیکن خدا کے لئے سوچئے کہ کیا اس تصور میں معقولیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے؟ آخر موہن جو ڈارو اور ٹیکسلا کی خالص غیر اسلامی تہذیبوں سے ہمارا واسطہ کیا ہے؟ ہم کس بنا پر ان کی ثقافت کو اپنی ثقافت کہتے ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ جب برصغیر تقسیم ہوا تو یہ کھنڈرات ہمارے حصے میں آگئے تھے؟

اگر یہی طرزِ فکر اختیار کرنا ہے تو ہمیں "جئے سندھ" "پختونستان" اور "مشرقی پاکستان کی خود مختاری" کی تحریکوں کا کوئی شکوہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ابھی عصبیت کی تحریکیں ہر جگہ محدود حلقوں میں ہیں، اور مسلمانوں کی اکثریت انکی مخالف ہے (سابق) سندھ کے چند افراد راجہ داہر کے نام سے خواہ کتنے خوش ہو لیتے ہوں لیکن اس خطے کے نیک دل اور اسلام کے نام پر جان نثار کرنے والے عوام کی اکثریت اس نعرے کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی رمضان میں سندھ ہی کے غیور مسلمانوں نے "یوم فتح باب الاسلام" مناکر محمد بن قاسمؒ کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سندھ کے عوام اپنی اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں

لیکن جن راستوں سے عصبیت کا یہ ذہن آرہا ہے، اگر ابھی سے ان کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ کی گئی اور اسلام کو اپنی حقیقی صورت میں اس ملک کے اندر نافذ نہ کیا گیا تو یاد رکھئے کہ عصبیت کے یہ جذبات پوری قوت کے ساتھ ہمارے اتحاد پر حملہ آور ہونگے آج صرف راجہ داہر کو ہیرو کہا گیا ہے، کل رنجیت سنگھ اور مہاراجہ بھاؤ کو ہیرو کہا جائے گا۔ اور پھر صرف محمد بن قاسمؒ ہی نہیں محمود غزنویؒ، ظہیر الدین بابر اور احمد شاہ ابدالی بھی لٹیرے قرار پائیں گے۔ اور پھر عجب نہیں کہ کوئی مسخرہ "ابلیس" اور "جنات" کو اپنا ہیرو قرار دے کر حضرت آدم علیہ السلام ہی کو لٹیرا کہہ ڈالے۔ (نعوذ باللہ العلی العظیم)۔

عوام میں اس قسم کے گھناؤنے خیالات کے پیدا ہونے کا ایک تیسرا اہم سبب وہ جھنجھلاہٹ بھی ہے جو بعض جائز شکایات سے پیدا ہوئی ہے، پاکستان کے ہر خطے کی طرح (سابق) سندھ کے کچھ مسائل بھی ہیں، اور عین ممکن ہے کہ ان کے مسائل دوسرے خطوں کی بہ نسبت زیادہ ہوں، حکومت کا فرض ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی تمام ممکنہ توانائیاں صرف کرے، اس مقصد کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھائے اور کم از کم ان لوگوں کو مطمئن کردے جو صرف جائز شکایات کی بنا پر "جئے سندھ" کی تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

لیکن ہم آخر میں پھر وہی بات دہرائیں گے کہ اس خطے کی مشکلات اور مسائل اپنی جگہ پوری توجہ کے مستحق سہی، مگر ان کی بنیاد پر عصبیت کے شر انگیز نعرے بلند کرنا کبھی ان مسائل کو حل نہیں کرسکتا، اس سے بات سلجھنے کے بجائے اور الجھے گی اور اس کے نتائج پوری ملت کے لئے نہایت مہلک ہوں گے ——————— وما علینا الا البلاغ۔

محمد تقی عثمانی
۱۷ رمضان المبارک ۸۸ھ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

پھر عظمت توحید زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

سفر کی اقسام
تقلید کا مسئلہ

قرطبیؒ نے بحوالہ ابن عربیؒ لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے۔ پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کی چھ قسمیں ہیں

اول ہجرت ہے یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف جانا، یہ قسم سفر عہد رسالت میں بھی فرض تھی اور قیامت تک بشرط استطاعت و قدرت فرض ہے (جبکہ دارالکفر میں اپنے جان و مال اور آبرو کا امن نہ ہو یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دارالحرب میں مقیم رہا تو گناہگار ہوگا۔

دوسرا دارالبدعت سے نکل جانا۔ ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں لے امام مالک سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں، جس میں سلف صالحین پر سب وشتم کیا جاتا ہو۔ ابن عربیؒ یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

واذا رأیت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم۔

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کیلئے سفر۔ یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو۔ یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا انی مھاجر الی ربی۔ ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا۔ فخرج منھا خائفا یترقب۔

پانچواں سفر آب و ہوا کی خرابی اور امراض کے خطرے سے بچنے کے لئے ہے۔ شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا کیونکہ شہری آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی۔ اسی طرح حضرت فاروق اعظم نے ابو عبیدہ رض کو حکم بھیجا تھا کہ دارالخلافت کو اردن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر پہنچائیں جہاں آب و ہوا خراب نہ ہو لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں۔ اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ

تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا کہ سرحد شام پر پہنچکر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا۔ صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اذا وقع بارض وانتم بہا فلا تخرجوا منہا واذا وقع بارض ولستم بہا فلا تہبطوا علیہا (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

جب کسی خطے میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔

اس وقت فاروق اعظم رض نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لیکر واپسی کا اعلان کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے گا نہیں اور جہاں یہ جائیگا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے۔ اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چھٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کیلئے ہے۔ جب کوئی شخص کسی مقام پر چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے۔ شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کیلئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں۔

(۱) سفر عبرت۔ یعنی دنیا کی سیاحت و سفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالٰی کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے۔ قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے۔ اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم۔ حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے، اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کیلئے تھا۔

(۲) سفر حج۔ اس کا چند شرائط کی ساتھ فرض اسلام ہونا سب کو معلوم ہے۔

(۳) سفر جہاد۔ اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

(۴) سفر معاش۔ جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہو سکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کر کے دوسری جگہ تلاش روزگار کرے۔

(۵) سفر تجارت۔ یعنی قدر ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا یہ بھی شرعاً جائز ہے۔ حق تعالٰی کا ارشاد ہے

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم

ابتغاء فضل سے مراد اس آیت میں تجارت ہے۔ اللہ تعالٰی نے سفر حج میں بھی تجارت کی اجازت دیدی ہے۔ تو تجارت کیلئے ہی سفر کرنا بدرجۂ اولٰی جائز ہوا۔

(۶) طلب علم کے لئے سفر۔ اس کا بقدر ضرورت دین فرض عین ہونا اور زائد از ضرورت کا فرض کفایہ ہونا معلوم ہے۔

(۷) کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا۔ یہ بجز تین مسجدوں کے درست نہیں، مسجد حرام مکہ مکرمہ مسجد نبوی مدینہ طیبہ۔ مسجد اقصٰی بیت المقدس۔ (یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دوسرے اکابر علماء سلف و خلف نے عام مقامات متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ محمد شفیع)

(۸) اسلامی سرحدوں کی حفاظت کیلئے سفر۔ جس کو رباط کہا جاتا ہے۔ احادیث کثیرہ میں اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔

(۹) عزیزوں دوستوں سے ملاقات کیلئے سفر حدیث میں اس کو بھی باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقربا و احباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والے کے لئے فرشتوں کی دعا کا ذکر فرمایا گیا۔ (یہ جب ہے کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو کوئی ادنیٰ غرض نہ ہو) واللہ اعلم

(قرطبی ص ۳۴۹ تا ص ۳۵۱ ج ۵ سورۂ نساء)

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحي اليهم فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ﴿۴۳﴾ بالبينات والزبر وانزلنا اليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم ولعلهم يتفكرون ﴿۴۴﴾

اللغات　اهل الذکر۔ لفظ ذکر چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی علم کے بھی ہیں۔ اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تورات کو بھی ذکر فرمایا ہے ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جیسا اس کے بعد والی آیت میں انزلنا الیک الذکر میں قرآن مراد ہے۔ اس لئے اہل الذکر کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے۔ اور یہاں اہل علم سے کون لوگ مراد ہیں اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ یہ قول ابن عباسؓ حسنؒ السدی وغیرہ کا ہے اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لیکر اہل الذکر کی تفسیر اہل قرآن سے کی ہے۔ اس میں زیادہ واضح بات رمانی، زجاج، الازہری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ المراد باهل الذکر علماء اخبار الامم السالفة كائنا من كان فالذكر بمعنى الحفظ كانه قيل اسألوا المطلعين على اخبار الامم يعلموكم بذلك اس تحقیق کی بنا پر اس میں اہل کتاب بھی داخل ہیں اور اہل قرآن بھی۔ بینات کے معنی معروف ہیں اور مراد اس سے یہاں معجزات ہیں۔ زُبُر دراصل زُبْرہ کی جمع ہے جو لوہے کے بڑے ٹکڑوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ آتونی زبر الحدید۔ ٹکڑوں کو جوڑنے کی مناسبت سے لکھنے کو زبر کہا جاتا ہے اور لکھی ہوئی کتاب کو زبر اور زبور بولتے ہیں۔ یہاں مراد اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ جس میں تورات۔ انجیل۔ زبور قرآن سب داخل ہیں۔

خلاصہ تفسیر　یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت و نبوت کا اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر اور انسان ہیں۔ اور نبی و رسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہ ہونا چاہئے یہ ان کا جاہلانہ خیال ہے کیونکہ آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں جن کی طرف ہم بھیجا کرتے تھے۔ تو اے مکہ والے منکرین اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور تمہارے خیال میں بھی مسلمانوں کی طرفداری نہ کریں۔

اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایات آپ کے واسطے سے لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں۔ اور تاکہ وہ

ان میں غور و فکر کیا کریں۔

روح المعانی میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مشرکین مکہ نے اپنے قاصد مدینہ طیبہ کے یہود کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجے کہ کیا یہ بات واقعی ہے کہ پہلے بھی انبیاء جنس بشر و انسان سے ہوتے آئے ہیں۔ اگرچہ لفظ اهل الذکر میں اہل کتاب اور مؤمنین سب داخل تھے مگر یہ ظاہر ہے کہ مشرکین کا اطمینان غیر مسلموں ہی کے بیان سے ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود رسول کریم کی بات پر مطمئن نہیں تھے تو دوسرے مسلمانوں کی بات کیسے مان سکتے تھے۔

احکام و معارف

ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے۔

آیت مذکورہ کا یہ جملہ فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارہ میں آیا ہے مگر الفاظ عام ہیں جو تمام معاملات کو شامل ہیں اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام کو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھکر عمل کریں اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ امت میں عہد صحابہ سے لیکر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے۔ جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتوی لیکر عمل کریں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہیں علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے انہیں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں اور تقلید بھی اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے۔

یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقع اجماع کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر مذکور ہیں اور علماء صحابہ و تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں، ان احکام میں وہ علماء براہ راست قرآن و حدیث اور اجماع پر عمل کریں ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید کی ضرورت نہیں، لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں یا جن میں آیات قرآن اور روایات حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے یا جن میں صحابہ و تابعین کے درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے۔ یہ مسائل و احکام محل اجتہاد ہوتے ہیں ان کو اصطلاح میں مجتہد فیہ مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جس عالم کو درجہ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے محض اپنی ذاتی رائے کے بھروسے ایک آیت یا روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لئے جائز نہیں اسی طرح جو احکام قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں ان کو قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی انہیں مجتہدین امت کا کام ہے جن کو عربی زبان عربی لغت اور محاورات اور طرق استعمال کا نیز قرآن و سنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع و تقوی کا اونچا مقام حاصل ہو جیسے امام اعظم ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ یا اوزاعیؒ، فقیہ ابو اللیث وغیرہ، جنہیں حق تعالیٰ نے قرب زمانہ نبوت اور صحبت صحابہ و تابعین کی برکت سے شریعت کے اصول و مقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور منصوص احکام سے غیر منصوص کو قیاس کرکے حکم لگانے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمہ مجتہدین میں سے

کسی کی تقلید لازم ہے۔ ائمۂ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطاء ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء محدثین و فقہاء امام غزالیؒ، رازیؒ، ترمذیؒ، طحاویؒ، مزنیؒ، ابن ہمامؒ ابن قدامہؒ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف و خلف باوجود علوم عربیت و علوم شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ہی کے پابند رہے ہیں سب مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں سمجھا، البتہ ان حضرات کو علم و تقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا کہ مجتہدین کے اقوال و آراء کو قرآن و سنت کے دلائل کو جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمہ مجتہدین میں جس امام کے قول کو وہ کتاب و سنت کے ساتھ اقرب پاتے اس کو اختیار کرلیتے تھے۔ مگر ائمہ مجتہدین کے مسالک سے خروج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے۔ تقلید کی اصل حقیقت اتنی ہی ہے۔

اس کے بعد روز بروز علم کا معیار گھٹتا گیا اور تقویٰ و خدا ترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دیجائے کہ جس مسئلے میں چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کرلیں اور جس میں چاہیں کسی دوسر کا قول لے لیں تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباع شریعت کا نام لیکر اتباع ہویٰ میں مبتلا ہوجائیں کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کرلیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین و شریعت کا اتباع نہیں ہوگا بلکہ اپنی اغراض و اہواء کا اتباع ہوگا۔ جو باجماع امت حرام ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے اور ابن تیمیہؒ نے بھی عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع ہویٰ کو اپنے فتاویٰ میں باجماع امت حرام کہا ہے۔

اس لئے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنیوالوں کو کسی ایک امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے جس سے دین کا انتظام قائم رہے۔ لوگ دین کی آڑ میں اتباع ہویٰ کے شکار نہ ہوجائیں۔ اس کی مثال بعینہ وہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ نے باجماع صحابہ قرآن کے سبعۃ احرف (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کردینے میں کیا کہ اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغات تھے جبرئیل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ مسلمانوں پر لازم کردیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن از تحریف کی بناء پر صرف ایک لغت اختیار کرلیا گیا اسی طرح ائمہ مجتہدین سب ائمہ حق ہیں اس میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں بلکہ اپنی صوابدید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کرلیا اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیم اور ڈاکٹروں میں سے کسی ایک ہی کو اپنے علاج کے لئے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھکر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھکر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔ وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لئے کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے

ڈاکٹر ماہر نہیں یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں۔

حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باہمی جدال و شقاق کی گرم بازاری نہ کوئی دین کا کام ہے، کبھی اہل بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا اور بعد میں طعن و طنز تک نوبت آگئی، پھر جاہلانہ جنگ و جدال نے وہ نوبت پہنچا دی جو آج عموماً دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا۔ فالی اللہ المشتکیٰ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

تنبیہ | مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ یہاں لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل موجود ہیں۔ خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد رابع باب الاجتہاد۔ اور علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث القاعدۃ الثالثہ فی المجتہدین۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ اور رسالہ عقد الجید۔ اور آخر میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رح کی کتاب الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد۔ اس مسئلے میں خاص طور سے قابل دید ہیں، اہل علم ان کی مراجعت فرمائیں۔

قرآن فہمی کے لئے حدیث رسول ضروری ہے
حدیث کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار ہے

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس

اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق قرآن کریم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان اور وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں۔ اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے، اگر یہ انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

علامہ شاطبی رح نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے انک لعلی خلق عظیم۔ اور حضرت صدیقہ عائشہ رض نے اس خلق عظیم کی تفسیر یہ فرمائی کان خلقہ القرآن۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، بعض تو ظاہر طور پر ہر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتے ہیں جن کو عام اہل علم جانتے ہیں اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے کیونکہ حسب تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق عادات سب کی سب بوحی خداوندی اور بحکم قرآن ہیں۔ اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو بالآخر وحی الٰہی سے اس کی تصحیح پھر تائید کر دی جاتی ہے اس لئے وہ بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر و بیان کو قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ جمعہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد بعثت کو ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہے یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ اس آیت سے ثابت

ہوا کہ قرآن پر عمل کرنے کے لئے جیسے یہ ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تلاوت کرکے امت کو سنادیں اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے معانی اور مقاصد کی تعلیم فرمائیں اس آیت سے تعلیم قرآن کی اور آیت زیر بحث سے تبیین قرآن کی ضرورت بھی ثابت ہوئی اور یہ بھی کہ قرآن کی تعلیم وتبیین کا فرض حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد فرمایا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ عام صحابہ کرام کی مادری زبان عربی ہونے اور ان کے اعلیٰ درجے کے فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود ان کے لئے بھی قرآن پر عمل بغیر تعلیم رسول اور بیان رسول کے ممکن نہ تھا۔ تو آج کون ایسا ہوسکتا ہے جو قرآن کو صحیح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں تعلیم ایمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مستغنی ہو۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تعلیم و بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس لئے پوری امت کا اجماع ہے کہ پوری سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تفسیر و بیان ہے۔ اس تفسیر و بیان سے ہٹ کر کوئی دوسری تفسیر و تعبیر قطعاً باطل و گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔ جس کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ حدیث و سنت کی تشریحات سے آزادی حاصل کرنیکے بعد قرآن کے الفاظ کی جس طرح چاہیں تاویل کرکے اپنی اغراض نفسانی کو قرآن کی زبان سے کہلوا سکتے ہیں جو اتباع شریعت و ہدیٰ کے بجائے خالص اتباع ہویٰ ہے۔ العیاذ باللہ العلی العظیم۔

مصاحب کے آداب

محمد بن حمید طوسی ایک مرتبہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، اچانک دروازے پر شور بلند ہوا، اس نے اپنے ایک غلام سے کہا: "یہ کیا شور ہے؟" غلام باہر گیا اور اس نے تھوڑی دیر میں واپس آکر بتایا کہ لوگوں نے آپ کے فلاں دشمن کو پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ لیا ہے، اور اب وہ اس کے بارے میں آپ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ طوسی نے یہ سنکر کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ اس پر ایک مصاحب بولا: الحمدللہ! خدا نے آپ کا دشمن قابو میں کروا دیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے خون سے زمین کو سیراب کرنے کا حکم دیدیں۔"

دوسرے مصاحب نے قتل کا کوئی اور طریقہ تجویز کیا، تیسرے نے کوئی اور یہاں تک کہ ہر مصاحب نے قتل کے سلسلے میں الگ الگ تجویز پیش کی۔

طوسی نے ہر مصاحب کی بات اطمینان سے سنی، اس کے بعد غلام سے مخاطب ہوکر بولا: "جاؤ، فوراً اس کی زنجیریں کھولدو۔ اور احترام کے ساتھ اسے یہاں لاؤ"۔ تھوڑی دیر میں غلام ایک شخص کو لیکر آئے، طوسی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے ملا، بڑی خوش خلقی کے ساتھ اسے کھانا کھلایا۔ اور حکم دیا کہ اسے عمدہ خلعت دیا جائے اور اعزاز کے ساتھ گھر پہنچا دیا جائے۔ تمام مصاحب یہ منظر دم بخود دیکھ رہے تھے، تھوڑی دیر میں طوسی ان سے مخاطب ہوا "یاد رکھو، بہترین مصاحب وہ ہوتا ہے جو اپنے دوست کو نیکی پر آمادہ کرے گناہ کے ارتکاب سے روکے اور اسے ترغیب دے کہ وہ نیکی کا بدلہ دوگنا کرکے ادا کرے اور برائی کا بدلہ درگذر کرنے اگر ہم ہر برائی کا بدلہ برائی سے دیتے رہیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کب ادا کریں گے۔ اور دیکھو، بادشاہوں کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو چاہئے کہ وہ بات کریں تو کھری، اور بولیں تو نپی تلی، اس سے جانبین کو راحت ہوتی ہے اور محبت دیرپا ہوجاتی ہے۔

سنو اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم ویغفر لکم ذنوبکم ومن یطع اللہ والرسول فقد فاز فوزاً عظیما۔ "اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو، وہ تمہارے اعمال کی اصلاح کردیگا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔ اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ عظیم کامیابی حاصل کرے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مواقیتِ احرام کا مسئلہ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

امّا بعد

حق تعالیٰ جل شانہ نے تمام عالم میں سے بیت اللہ کی زمین عزت و شرف کے لئے مخصوص فرما کر اس پر اپنا بیت بنایا جو دنیا میں سب سے زیادہ معظم و مکرم ہے، اس کی تعظیم و شرف کے اظہار کے لئے اس کے گرد یکے بعد دیگرے کئی حلقے قائم فرمائے اور ہر ایک حلقے کی ساتھ کچھ آداب و احکام مخصوص فرمائے۔

سب سے پہلا اور بیت اللہ سے متصل حلقہ مسجد حرام کا ہے جس کے اندر بیت اللہ واقع ہے، اس کے خاص آداب و احکام ہیں، جن میں کچھ تو وہ ہیں جن میں دنیا کی دوسری مساجد بھی شریک ہیں، اور کچھ اس مسجد حرام کی ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً اس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کی برابر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف مسجد کے اندر ہوتا اور مسجد حرام سے باہر کوئی سات چکر لگائے طواف ادا نہیں ہوگا۔ (غنیۃ الناسک)

دوسرا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع شہر مکہ مکرمہ کا ہے، اس کے بھی خاص آداب و احکام اور پابندیاں ہیں مثلاً یہ کہ پورا شہر مکہ بھی مسجد حرام کی طرح عام پناہ گاہ ہے۔

اس میں کسی مجرم کو، بھی جو حرم سے باہر جرم کر کے حرم میں داخل ہوگیا وہاں قتل نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے نکلے، نکلنے کے بعد سزا دی جائیگی اس میں کسی جانور کا شکار جائز نہیں، اس کے درختوں کا اور عام گھاس کا کاٹنا بھی جائز نہیں مگر اس کی پابندیاں پہلے حلقے یعنی مسجد حرام سے کم ہیں۔

تیسرا بڑا حلقہ حرم کا ہے جو پہلے دونوں حلقوں پر مشتمل ہے، حرم شریف کے حدود مکہ مکرمہ کے چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے معین و محدود ہیں۔

جدہ کی طرف سے جانے والوں کے لئے حد حرم حدیبیہ[1] کے قریب ہے جہاں دو ستون علامت حرم کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں اس تیسرے حلقے کے احکام و آداب اور شرعی پابندیاں بھی تقریباً وہی ہیں جو دوسرے حلقے کی بیان ہو چکی ہیں البتہ شرف مکانی کے درجات بیت اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے متفاوت ہوں گے۔

---

[1] آجکل اس جگہ کو شمیسیہ کہتے ہیں — مدیر

حدود حرم مکہ مکرمہ کے چاروں طرف متعین ہیں کسی طرف کم اور کسی طرف زیادہ، سب سے قریب حد حرم تنعیم ہے جو مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور سب سے بعید نو میل پر ہے۔

چوتھا حلقہ ان سب سے وسیع تر ہے جس میں یہ پہلے تینوں حلقے سمائے ہوئے ہیں، وہ حدود مواقیت ہیں، مواقیت میقات کی جمع ہے۔ حرم محترم کے تمام اطراف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مقامات متعین فرما دیئے ہیں، جہاں سے مکہ مکرمہ میں آنے والے پر لازم کیا گیا ہے کہ بغیر احرام کے آگے نہ بڑھے۔ احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک کو میقات کہتے ہیں اور پورے حلقہ مواقیت کو فقہاء کی اصطلاح میں حل کہا جاتا ہے۔ اس حلقے سے باہر تمام کو آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حل صغیر کے بھی کچھ خاص آداب و احکام ہیں، مگر پہلے تینوں حلقوں سے کم ہیں اس حلقے کی پابندی صرف اس قدر ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والا اس حلقے میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتا ہے، اگر کوئی بغیر احرام کے داخل ہو جائے تو اس پر دم یعنی قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی اس مقالہ میں زیر بحث یہی چوتھا حلقہ ہے۔

اس کے احکام کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے کچھ اصطلاحی الفاظ کی تشریح بیان کر دینا ضروری ہے۔

اصطلاحی الفاظ کی تشریح

پہلے حلقہ کا اصطلاحی نام مسجد حرام ہے، دوسرے کو مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے، تیسرے کا اصطلاحی نام حرم ہے چوتھا حلقہ حدود حرم سے باہر مگر حدود مواقیت کے اندر ہے اس کا اصطلاحی نام حل ہے یعنی اس میں شکار وغیرہ حلال ہے۔ حدود مواقیت سے باہر سارا عالم آفاق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ حرم کی پابندی شکار وغیرہ کی جیسے حل میں نہیں ہے ایسے ہی حل سے باہر آفاق میں بھی نہیں اس لئے حل کے مفہوم میں آفاق بھی داخل ہے۔ اسی لئے بعض علماء نے حلقہ مواقیت کے اندر حرم سے باہر کے حل کو حل صغیر کہتے ہیں اور حدود مواقیت سے باہر آفاق کو حل کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مواقیت حج کی تعیین

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ حدیث منقول ہے۔

> وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لاھل المدینۃ ذا الحلیفۃ ولاھل الشام الجحفۃ ولاھل نجد قرن المنازل ولاھل الیمن یلملم (بخاری کتاب الحج)

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ اور اہل شام کے لئے جحفہ اور اہل نجد کے لئے قرن المنازل اور اہل یمن کے لئے یلملم میقات مقرر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار میقات متعین فرمائے، ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل اور یلملم ان مواقیت کی تفصیلی تحقیق آگے آجائے گی۔

اور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں بروایت ابن عمرؓ یہ بھی منقول ہے کہ جب فاروق اعظمؓ کے زمانے میں عراق فتح ہونے کے بعد اس کے دو شہر، بصرہ اور کوفہ بسائے گئے، تو اہل عراق حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لئے میقات قرن المنازل کو مقرر فرمایا ہے اور وہ ہمارے راستے سے بہت دور ہے، اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو ہماری مسافت اور مشقت بہت بڑھ جاتی ہے اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا۔

> فانظروا حذوھا من طریقکم

فحاذ لهم ذات عرق۔

(صحیح البخاری کتاب الحج)

(ترجمہ) اپنے راستہ سے اس کی محاذات دیکھ لو، چنانچہ
(اس طریقہ سے) فاروق اعظمؓ نے ان لوگوں
کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ پانچواں میقات ذات عرق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقرر نہیں فرمایا تھا حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر فرمایا۔

لیکن صحیح مسلم کی روایت میں شک (تردد) کے ساتھ اور نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں بغیر شک کے یہ بھی منقول ہے کہ اہل عراق کے لئے ذات عرق کی تعیین خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، —— یہ روایتیں قوت وصحت کے اعتبار سے اگرچہ بخاری کی روایت کی ہم پلہ نہیں ہیں، مگر ان کو غیر معتبر بھی نہیں کہا جاسکتا اسی لئے شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس واقعہ سے پہلے وہ حدیث نہ پہنچی ہو جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذات عرق کو اہل عراق کا میقات مقرر فرمانا مذکور ہے اس لئے انہوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیکر متعین فرمایا اور حضرت فاروق اعظمؓ کے خصوصی فضائل میں سے ہے کہ ان کا اجتہاد ٹھیک حدیث کے مطابق واقع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل عراق کا میقات ذات عرق قرار پایا خواہ اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہو یا حضرت فاروق اعظمؓ نے اس سے کل مواقیت پانچ ہوگئے، ان پانچوں مواقیت اور ان کے مقامات کی ضروری تشریح یہ ہے۔

مواقیت خمسہ کی ضروری تشریح

ذوالحلیفہ اہل مدینہ کا میقات ہے۔ مصر اور شام کے مسافر جو تبوک کے راستے سے آتے ہیں ان کا میقات بھی یہی ہے، یہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔ جس کو آبار علی یا بیر علی بھی کہا جاتا ہے اور آجکل یہی نام مشہور ہوگیا ہے (حاشیہ ارشاد الساری) اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ تک نو یا دس مرحلے ہیں (البحر الرائق)

اور مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات القلوب میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ایک سو اٹھانوے میل بتلایا ہے اس مقام سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد شجرہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہاں ایک درخت تھا اس کے نیچے آپ نے احرام باندھا تھا پھر اس جگہ مسجد بنادی گئی، افضل واولیٰ یہی ہے کہ سنت کے مطابق احرام اسی مسجد سے باندھا جائے، اگرچہ یہ ذوالحلیفہ کے ابتدائی حصہ کے بعد ہے اور عام مواقیت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ میقات کے ابتدائی حصہ پر احرام باندھا جائے، تاکہ پوری میقات پر اس کا گذر بحالت احرام ہوجائے، مگر ذوالحلیفہ بوجہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں ابتداء ذوالحلیفہ کے بجائے مسجد شجرہ سے احرام افضل ہے۔

سید نور الدین سمہودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی سے مسجد شجرہ تک ہاتھ سے پیمائش کی تو مسجد نبوی کے دروازے باب السلام سے مسجد شجرہ تک انیس ہزار سات سو بتیس (۱۹۷۳۲) ہاتھ پایا، حاشیہ ارشاد الساری میں یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے یہ فاصلہ پانچ میل سے کچھ کم ہوا، کیونکہ میل ہمارے نزدیک چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے اوس لوہے کے ذراع سے جو آجکل مستعمل ہے۔

(حاشیہ ارشاد ص ۵۴)

جحفہ یہ رابغ کے قریب ایک گاؤں تھا جس کو مہیعہ بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کے فاصلہ میں شدید

اختلاف ہے۔ ارشاد الساری میں ملا علی قاری نے تئیس میل
بتلایا ہے اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی رح نے بحوالہ
علامہ مرشدی بیاسی میل لکھا ہے، اس طرح مراحل کے اعتبار
سے فتح الباری شرح البخاری میں بحوالہ شرح مہذب نووی
اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تین مرحلے بتلایا اور شیخ عبد اللہ بن
سالم نے شرح بخاری میں مکہ مکرمہ تک پانچ منزل کا فاصلہ
لکھا ہے اور مدینہ منورہ تک سات منزل (حیات القلوب
قلمی ص ۲۱) غالباً وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ جحفہ سے مکہ مکرمہ
کے لئے راستے مختلف ہیں کسی راستہ سے مسافت کم ہے کسی سے زیادہ
یہ گاؤں جحفہ یا مہیعہ عرصہ دراز سے ویران اور بے نشان ہو گیا
ہے، اس لئے اس طرف آنے والے رابغ سے احرام باندھتے
ہیں کیونکہ رابغ جحفہ سے کچھ پہلے ہے، یہاں سے احرام باندھنے
والا گویا اصل میقات سے کچھ پہلے احرام باندھتا ہے جو سب کے
نزدیک جائز ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے۔

اور رابغ ساحل سمندر پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی
طرف جانے والوں کے راستہ پر مشہور قصبہ ہے اور آجکل تو
اچھا شہر بن گیا ہے جس میں مسافروں کے قیام کے لئے بڑے
بڑے ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔

قرن المنازل یہ اہل نجد کا میقات ہے جس میں نجد
یمن، نجد حجاز و نجد تہامہ شامل ہیں۔ لغت فقہ المغرب میں
ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو میدان عرفات کے اوپر ہے
اور شرح مصابیح میں ہے بیضہ کی مانند ایک چکنا صاف اور
مدور پہاڑ ہے عرفات کے اوپر آیا ہوا ہے، اہل مکہ اور ان
اطراف کے لوگ اس پہاڑ کو کرا بلغ الکاف کہتے ہیں اور
قاموس میں ہے کہ قرن اس پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے
متصل وادی کو بھی قرن کہتے ہیں اور اس وادی کے اندر
ایک گاؤں جو طائف کے قریب ہے اس کو بھی قرن کہا جاتا
ہے (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵)

البحر الرائق میں ہے کہ قرن کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو
مرحلہ ہے، اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بھی
بحوالہ نہایہ شرح ہدایہ دو مرحلہ کا فاصلہ اور باقانی شرح
ملتقی الابحر کے حوالہ سے بیاسی میل کا فاصلہ بتلایا ہے (حیات
القلوب قلمی ص ۲۱)

یلملم، اہل یمن تہامہ کا میقات ہے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ
کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے، اس زمانہ میں اس کو
سعدیہ کہا جاتا ہے علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری
میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے (حیات القلوب ۲۱)
علامہ عینی نے لکھا ہے۔

قال ابن حزم هو جنوب مكة و
منه الى مكة ثلاثون ميلا
(عمدہ ص ۱۴۰ ج ۵)

ابن حزم کہتے ہیں کہ یلملم مکہ مکرمہ کے جنوب
میں ہے اور اس سے مکہ مکرمہ تک تیس میل کا
فاصلہ ہے۔

اور شیخ عبد الرحمن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام
ص ۵، ج ۱ میں اس کا فاصلہ چالیس میل بتلایا ہے، اور قسطلانی
شرح بخاری، فتح القدیر شرح ہدایہ اور معجم البلدان وغیرہ میں میلوں
کا فاصلہ بتلانے کے بجائے مرحلتین یا لیلتین کہا گیا ہے۔

ذات عرق اہل عراق کا میقات ہے۔ ایک گاؤں کا
نام ہے جو عراق کی طرف سے عقیق کے بعد مکہ مکرمہ سے دو منزل
کے فاصلہ پر تھا، آجکل ویران ہو گیا ہے: اسی لئے اب اس کے
بجائے عقیق سے احرام باندھا جاتا ہے کیونکہ ذات عرق کا صحیح
تعین نہ رہا۔ عقیق سے احرام باندھنے میں اصل میقات سے کچھ
پہلے احرام ہوگا اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ عابد مالکی رح نے ہدایۃ الناسک میں فرمایا کہ ذات
عرق مکہ مکرمہ سے دو مرحلے کے فاصلہ پر طائف کے ایک راستہ پر
گاؤں تھا جو اب ویران ہو گیا ہے اس کا محل وقوع اس مقام
کے قریب تھا جس کو آجکل سیل کہا جاتا ہے (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵)

قسطلانی نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے بیالیس میل بتلایا ہے، اسی طرح فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل کا فاصلہ لکھا ہے، نووی ابن حجر مکی نے فرمایا کہ اس کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کا ہے جیسا کہ قرن اور یلملم کا فاصلہ دو مرحلے ہیں (حیات القلوب) و مثلہ فی البحر۔

مواقیت خمسہ کے احکام

جو لوگ آفاق یعنی اطراف عالم سے آنے والے ان میقاتوں کے راستے سے گزرتے ہیں اگر وہ مکہ مکرمہ میں جانے کے مقصد سے ان مواقیت سے آگے، حل صغیر کی طرف جائیں جو مواقیت کے اندر اور حرم سے باہر کے علاقے کا نام ہے تو ان پر لازم ہے کہ ان مقامات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آگے بڑھیں بغیر احرام کے آگے بڑھنا گناہ ہے اور جو ایسا کرے گا اس کے ذمہ دم (قربانی) دینا واجب ہوگا (ہدایہ۔ ارشاد الساری)

امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک آفاق یعنی حل کبیر سے آنے والا جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے خواہ یہ ارادہ کسی دنیوی غرض تجارت یا عزیزوں سے ملاقات وغیرہ کی نیت سے کیا ہو، مگر بیت اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو اور بیت اللہ کا یہ حق ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص میقات سے آگے مکہ کی طرف بغیر احرام کے نہ بڑھے (ہدایہ)

امام شافعی رح کے نزدیک یہ پابندی صرف اس شخص کے لئے ہے جو عبادت حج یا عمرہ کے قصد سے مکہ مکرمہ کا ارادہ کر رہا ہے۔ کسی تجارتی غرض یا عزیزوں سے ملاقات یا تفریحی طور سے جانے والے پر احرام باندھ کر جانے اور کم از کم عمرہ ادا کرنے کی پابندی نہیں ہے (فتح القدیر شرح ہدایہ)

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہے جو آفاق کے کسی علاقے سے آئے مگر کسی میقات کے راستے مکہ مکرمہ جانے کے لئے حل صغیر میں داخل ہوتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جو لوگ پانچ میقاتوں میں سے کسی میقات پر نہیں گذرتے دوسرے راستوں سے حل صغیر پھر حرم میں داخل ہوتے ہیں ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس پابندی ہی سے آزاد ہیں اور بغیر احرام کے حرم میں داخل ہو سکتے ہیں، اور اگر ان پر بھی یہ پابندی ہے تو ان کو کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا، ملا علی قاری نے اپنے شرح مناسک میں اس کے متعلق فرمایا ہے۔

وعين هذه المواقيت ليست بشرط ولهذا اليصح الاحرام قبلها بل الواجب عينها أو حذوها اى محاذاتها ومقابلتها فمن سلك غير ميقات اى طريقا ليس فيه ميقات معين برا أو بحرا اجتهد أحرم اذا حاذى ميقاتا منها اى من المواقيت المعروفة ومن حذ والابعد اولى فان الافضل ان يحرم من اول الميقات وهو الطرف الأبعد عن مكة حتى لا يمر بشئ مما يقال ميقاتا غير محرم ولو احرم من الطرف الاقرب إلى مكة جاز باتفاق الاربعة - وإن لم يعلم المحاذات فانه لا يتصور عدم المحاذات - فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد الساری [۵۶])

وقال فى حاشية قوله كجدة فانها على مرحلتين عرفتين من مكة وثلاث مراحل شرعية ووجهه ان المرحلتين اوسط المسافات والا فالاحتياط الزيادة كذا فى شرح نظم الكنز واقول لعل وجهه ايضا ان اقرب المواقيت الى مكة على

مرحلتین عرفیتین من مکۃ فقد بین لک

(الارشاد الساری ص ۵۶)

یہی مضمون دوسری تمام کتب فقہ میں مختصراً یا مفصلاً مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی میقات معین کے اوپر سے نہیں گذرتے بلکہ درمیانی راستوں میں سے کسی راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہیں، احرام کی پابندی ان پر بھی لازم ہے اور طریقہ ان کے لئے یہ ہے کہ وہ جس راستہ سے حل صغیر کے اندر داخل ہو رہے ہیں اس راستہ کا جو حصہ کسی میقات کی محاذات میں ہو اسی جگہ سے احرام باندھ لیں۔ اگر راستہ ایسا ہے کہ ایک سے زائد میقاتوں کی محاذات راستہ میں آتی ہے تو افضل یہ ہے کہ میقات اولیٰ کی محاذات سے احرام باندھیں اور اگر اس سے آگے بڑھ کر قریبی میقات کی محاذات سے احرام باندھ لیا تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اصل بنیاد اس حکم کی صحیح بخاری کی وہ حدیث مذکور ہے جس میں اہل عراق نے یہی سوال حضرت فاروق اعظم رضؓ کے سامنے پیش کیا اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا۔

انظروا حذوها من طريقكم فحد لهم ذات عرق (بخاری)

اپنے راستہ سے ان کی محاذات دیکھو، پھر فاروق اعظمؓ نے (اس طریقے سے) ان کے لئے ذاتِ عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس میں حضرت فاروق اعظمؓ نے دوسرے راستوں سے گذرنے والوں کے لئے ایک ضابطہ بنا دیا کہ ان کا راستہ جو حل صغیر میں داخل ہونے کا ہے اس راستہ پر جہاں کسی میقات کی محاذات آجائے وہی ان لوگوں کے لئے میقات کے حکم میں ہے۔ یہاں سے مکہ کی طرف آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں۔

پھر اس ضابطہ کی رو سے اہل عراق کے لئے ان کے راستہ کے اس حصہ کو میقات قرار دیدیا جو قرن المنازل کے محاذات میں ہے یعنی ذات عرق۔

محاذاتِ میقات کس طرح معلوم کی جائے

محاذات کے لغوی معنی مسامتت کے ہیں جس کی تشریح شیخ ابن حجر ہیتمی مکی نے تحفۃ المحتاج شرح منہاج میں بالفاظ ذیل کی ہے۔

(ومن سلك طريقاً لا ينتهي الى ميقات فان حاذى) بالمعجمة (ميقاتاً) اى سامته بان كان على يمينه او يساره فلا عبرة بما امامه او خلفه (احرم من محاذاته)

(تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص ۴۲ ج ۴)

(ترجمہ) محاذات کا مطلب یہ ہے کہ میقات اس کے دائیں یا بائیں آجائے، سامنے اور پیچھے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

مطلب ظاہر ہے کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ میقات مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے مسافر کی دائیں یا بائیں جانب آجائے۔ اور جب تک میقات اس کے آگے رہے تو محاذات نہیں ہوئی اور جب اس کے پیچھے پڑ جائے تو محاذات سے تجاوز ہو گیا۔ مسائل نماز میں بھی محاذات کا یہی مطلب ہوتا ہے، اس کتاب میں اس کے بعد فرمایا ہے۔

(لم تجز محاذاته) الى جهة الحرم (بغير احرام) وخرج بقولنا الى جهة الحرم مالو جاوزه يمنة او يسرة فله ان يؤخر احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله الماوردي وجزم به غيره وبه يعلم ان الجائي من اليمن في البحر له ان يؤخر احرامه الى جدة لان مسافتها الى مكة

لہ خط کشیدہ عبارت کا مفہوم کلام فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں نہیں ملتا۔

کما افادہ مطلوا انتھی

عبارات مرقومہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مسافر جب راستہ میں کسی میقات کی محاذات پر پہونچا مگر اس کو کسی وجہ سے اس میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانا نہیں ہے بلکہ اس کا راستہ کسی دوسری سمت سے ہے تو اس کے لئے اس محاذات پر احرام باندھنا واجب نہیں ہے بلکہ جس راستہ سے اس کو مکہ مکرمہ کی طرف جانا ہے اس راستہ پر محاذات کو دیکھا جائے گا۔ کیونکہ محاذات میقات سے بغیر احرام تجاوز کرنا جو شرعاً ممنوع ہے اس تجاوز سے مراد تجاوز الی جہۃ الحرم ہے دوسری کسی سمت میں تجاوز ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ تحفہ کی عبارت مذکورہ سے واضح ہو گیا۔

اور غنیۃ الناسک میں مواقیت کی تعریف ہی اس طرح کی ہے۔

ھی المواضع التی لا یجوز ان یتجاوزھا
الی مکۃ والحرم ولو لحاجۃ الا محرماً

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا احرام تجاوز ممنوع وہ ہے جو تجاوز الی الحرم ہو دوسری کسی جہت کی طرف تجاوز ممنوع نہیں۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس دوسری محاذات میں یہ ضروری ہے کہ اس محاذات سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ کم سے کم اتنا ہی ہو جتنا اصل میقات سے فاصلہ ہے۔ مثلاً کوئی شخص یلملم کی محاذات سے جدہ کی طرف بڑھا اور جدہ کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کو احرام اس جگہ باندھنا چاہئے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ یلملم کے فاصلہ کی برابر ہو۔ اور حسب تصریح فقہاء یلملم کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرحلتین کا ہے اور جدہ کا فاصلہ بھی مرحلتین ہے تو دونوں فاصلے مساوی ہونے کی وجہ سے جدہ سے احرام باندھنا جائز ہوگا۔

محاذات کی یہ تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے بھی اقرب ہے اور فقہاء کی تفسیر سے بھی اسی کی ترجیح ہوتی ہے۔ صاحب بدائع کی ایک عبارت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

فاما اذا قصدھا من طریق غیر مسلوک
فانہ یحرم اذا بلغ موضعاً یحاذی
میقاتاً من ھٰذہ المواقیت لانہ اذا
حاذی ذلک الموضع میقاتاً من المواقیت
صار فی حکم الذی یحاذیہ فی القرب
من مکۃ (بدائع ص۱۶۴ ج۲)

محاذات کی ایک دوسری تفسیر

علامہ ملا اخوند جان مرغنانی مہاجر مکی نے مواقیت حج کی تحقیق میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کی تاریخ تصنیف ۱۳۱۳ھ ہے اور ۱۳۲۲ھ میں تاشقند کے ایک پریس میں چھپا ہے یہ رسالہ حضرت حاجی شیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدنی نے احقر کو عطا فرمایا تھا جو احقر کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح حدود حرم کے ذریعہ تمام حلقہ حرم کی تعیین کی جاتی ہے کہ حد حرم سے دوسری حد تک ایک خط ملایا جائے اسی طرح تیسری چوتھی حدود کے باہم خطوط ملا کر ان خطوط کے درمیان جو رقبہ زمین آتا ہے وہ حرم کہلاتا ہے۔

اسی طرح مواقیت کے حلقے کو سمجھنا چاہئے ایک میقات سے دوسرے میقات تک خط ملا کر یہ خط محاذات ہوگا خط سے باہر آفاق اور خط کے اندر حل کہا جائیگا۔ اس خط محاذات سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کی شکل بھی رسالہ کے حاشیہ پر ایک مخمس کی صورت میں یہ دی ہے
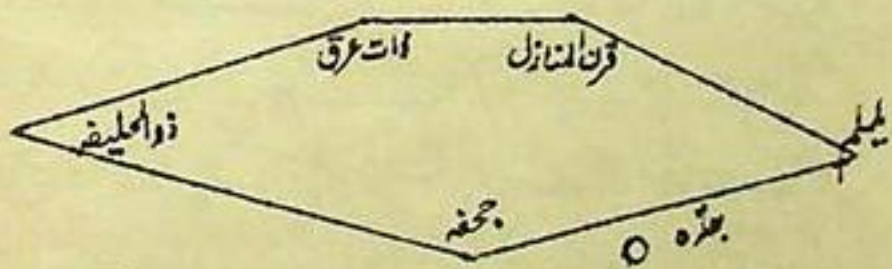
اس تفسیر محاذات کے مطابق یلملم سے جو خط جحفہ کے ساتھ ملایا جائیگا تو جدہ اس خط سے باہر کافی فاصلہ پر رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر جدہ سے بھی آگے بحرہ کے قریب تک بلا احرام جا سکیں

محاذات کی یہ تفسیر اگرچہ قواعد محاذات کی رو سے تو معقول ہے مگر فقہاء کے کلام میں اس کی تائید نہیں ملتی بلکہ اس کے خلاف یہ تصریحات اوپر گذر چکی ہیں کہ اہل یمن و بلاد مشرق کے باشندے جب جدہ کی طرف سے داخل حل ہوں تو ان پر یہ پابندی لازم ہے کہ جس قدر مسافت یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے اسی قدر مسافت اس طرف سے بھی ہونی چاہئے مثلاً وہ مرحلتین ہے تو ادھر سے بھی مرحلتین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ضروری ہے اور وہ جدہ پر ہی ہو سکتا ہے جدہ سے آگے نہیں۔

واملا اخوندجان کی عبارت اس کے متعلق یہ ہے۔

ظاهر ان المسجد مشتمل على البيت وحاوله من كل جهة ومكة مشتملة بها والحرم مشتمل بالثلاث ممتد من كل جهة الى الحل الصغير المحيط بالحرم ولا شك ان الحرم غير مختص بالعلامات الموضوعة فى الطريق بل هو السطح الممتد من كل جهة قربا وبعدا ولا يتوهم احد ان الحرم المكانات المتصلة بالعلامات فقط وكل عاقل يفهم ان الاماكن بين العلامات من ارض الحرم مثلا العلامة عند التنعيم الى العلامة عند حديبية كلها حرم لا يقتل صيده ولا يقطع شجره۔

ثم الحل الصغير يبتدء من اطراف الحرم من كل جهة الى المواقيت كانها مخمسة الشكل والحل الصغير بين الحرم والحل الكبير الذى هو جميع الآفاق والمواقيت بعض اجزاء الحل ولهذا يجوز لاهلها تاخير الاحرام الى قريب حد الحرم كما يجوز لاهل الحل الصغير (الى قوله) فتحصل من ذلك ان حرم الحرم اى المواقيت مثل الحرم المحيط بما فى جوفه مثل الخطوط الممتدة بين النقاط فكما ان النقاط مواقيت فكذلك الخطوط بينها والا لجاز الدخول الى الحرم بلا احرام من بين المواقيت

(رسالہ اخوند جان ص ۱۷۳ طبع تاشقند)

پاکستان، ہندوستان اور مشرقی ممالک سے آنیوالوں کا میقات

آج کل ان ممالک مشرقیہ سے آنے والے حجاج کے لئے راستے دو ہیں، ایک ہوائی دوسرا بحری، ہوائی جہازوں کا راستہ عموماً خشکی کے اوپر سے براہ قرن المنازل ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز قرن منازل اور ذات عرق دونوں میقاتوں کے اوپر سے گذرتے ہوئے اول حل میں داخل ہوجاتے ہیں اور پھر جدہ پہنچتے ہیں۔ اس لئے ہوائی سفر میں تو قرن المنازل کے اوپر آنے سے پہلے پہلے احرام باندھنا لازم و واجب ہے اور چونکہ ہوائی جہازوں میں اس کا پتہ چلنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس وقت اور کب یہ جہاز قرن المنازل کے اوپر گذرے گا اس لئے اہل پاکستان اور ہندوستان کے لئے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں اگر بغیر احرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ پہونچ گئے تو ان کے ذمہ دم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہوجائے گی اور گناہ اس کے علاوہ ہوگا جس کی وجہ سے حج ناقص رہ جاتا ہے مقبول نہیں ہوتا۔ بہت سے حجاج اس میں غفلت کرتے ہیں۔

چین، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے ہوائی جہاز بھی اگر خشکی پر پرواز کریں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں اگر ان کے جہاز خشکی کے بجائے سمندر کے اوپر سے پرواز کر کے جدہ پہونچیں تو ان کا حکم وہ ہوگا جو بحری جہاز سے آنے والوں کا ابھی لکھا جائے گا۔

مشرقی ممالک کے لئے دوسرا راستہ بحری سفر کا ہے۔

اس راستہ سے جانے والے بحری جہاز قدیم زمانے میں تو یلملم کے ساحل پر اترتے تھے جو یمن کا ایک حصہ ہے اور اہل یمن کی طرح وہ بھی میقات یلملم سے گذر کر حل میں پھر حرم اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے، اسی لئے عام فقہاء کی تصریحات بھی ہیں کہ ہندوستان، پاکستان اور تمام بلاد مشرق کا میقات یلملم ہے۔ لیکن مدت دراز سے یہ ساحل متروک ہو گیا اب بحری جہاز یہاں نہیں ٹھہرتے بلکہ ساحل یلملم سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر محاذات یلملم سے گذرتے ہوئے سمندر ہی میں آگے بڑھ جاتے ہیں، اور ساحل جدہ پر قیام کرتے ہیں۔ جدہ ہی سے سب مسافر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں

اس صورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ ان ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والے مسافروں کے راستے میں عین میقات تو کوئی پڑتا نہیں البتہ محاذات میقات یلملم سے دو جگہ ہوتی ہے، ایک درمیان سفر یلملم کے مقابل سے گذرتے ہوئے دوسرے سفر کے اختتام پر جدہ میں، سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی میقات یا اس کی محاذات سے بلا احرام تجاوز کرنا جو ممنوع و ناجائز اور موجب دم ہے وہ اس وقت ہے جبکہ یہ ان کا تجاوز الی جہۃ الحرم ہو۔ اور اگر اس محاذات سے سمندر ہی میں آگے بڑھتا ہوا آفاق ہی کے اندر سفر کرے تو یہ تجاوز عن المیقات اور موجب دم نہیں ہوگا۔ جیسا کہ تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے اس کی تصریح پہلے آچکی ہے جس کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

وخرج بقولنا الی جہۃ الحرم مالو جاوزہ یمنۃ او یسرۃ فلہ ان یؤخر احرامہ لکن بشرط ان یحرم من محل مسافتہ الی مکۃ مثل مسافۃ ذلک المیقات کما قالہ الماوردی وجزم بہ غیرہ وبہ یعلم ان الجائی من الیمن فی البحر لہ ان یؤخر احرامہ من محاذاۃ یلملم الی جدۃ لان مسافتہا الی مکۃ کمسافۃ یلملم کما صرحوا بہ

(تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص ۴۵ ج ۴)

اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرقی ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والوں کے لئے محاذات یلملم پر احرام باندھنا واجب نہیں ہاں کوئی یہیں پر احرام باندھے تو افضل ہونے میں شبہ نہیں، کیونکہ میقات سے جتنا پہلے کوئی احرام باندھے اُتنا ہی ثواب زیادہ ہے۔

اب قابل غور سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ان لوگوں پر محاذات یلملم سے احرام باندھنا واجب نہ ہوا تو پھر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا جہاں سے تجاوز بلا احرام جائز نہیں۔

جدّہ سے احرام باندھنے کا مسئلہ

یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ خشکی کے اوپر سے جدہ پہونچنے کے لئے میقات قرن المنازل اور میقات ذات عرق کے اوپر سے گذرنا ہوتا ہے اس لئے ہوائی جہاز کے مسافروں کو بلا احرام جانا جائز نہیں، پاکستان ہندوستان والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔

البتہ غور طلب مسئلہ بحری جہازوں کا اور ان کے مسافروں کا ہے کہ جب میقات یلملم کی محاذات سے احرام واجب نہ ہوا تو اب کہاں واجب ہوگا۔

دالا اخوندجان تحریر کے مطابق تو یہ مقام جدہ شہر سے بھی کچھ آگے چل کر آئے گا، مگر فقہاء کی تصریحات اس سے مختلف ہیں۔ عام فقہاء کے نزدیک جدہ کی طرف سے جانے والے مشرقی مسافروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مقام پر احرام باندھیں جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے اس فاصلہ سے کم نہ ہو جو یلملم اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے۔ اب یہ مقام کونسا ہوگا۔ اس کے متعلق علامہ ابن حجر مکی کی کتاب تحفہ شرح منہاج کے حوالے سے

یہ تصریح ابھی گذر چکی ہے کہ یہ مقام جدہ سے کیونکہ مسافت
جدہ کی مکہ مکرمہ سے اتنی ہی ہے جتنی یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے۔

لہ ان یؤخر احرامہ من محاذات یلملم
الی جدۃ لان مسافتھا الی مکۃ کمسافۃ یلملم

علامہ ابن حجر مکی کی تصریحات بالا سے تو یہ معلوم ہوا کہ حقیقی محاذات
اس طرف سے معلوم کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ مسافت مرحلتین
کا اعتبار کیا جائے جس طرح یلملم سے مکہ مکرمہ دو مرحلے پر ہے۔
اسی طرح جدہ سے دو مرحلہ ہے اس لئے مسافت برابر ہونے
کی وجہ سے جدہ ہی محاذات یلملم قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ میں حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے
بھی کسی قدر فرق کی ساتھ اس کی موافقت فرمائی وہ یہ کہ
اگر حقیقی محاذات کا علم نہ ہو تو پھر دو مرحلے کی مسافت کا اعتبار
کرکے جدہ ہی کو بحکم میقات سمجھا جائے گا، ان کے الفاظ
مناسک ملا علی قاری میں یہ ہیں۔

وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین
من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف
البحر۔ (ارشاد الساری ص۵۶)

اسی طرح غنیۃ الناسک میں بحوالہ طوالع لکھا ہے

وان لم یعلم المحاذات فعلی مرحلتین عرفیتین
من مکۃ کجدۃ من طرف البحر فانھا علی مرحلتین
عرفیتین من مکۃ وثلث مراحل شرعیۃ
طوالع (غنیۃ الناسک ص۲۲)

اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری
مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اب سے پچاس سال پہلے
۱۳۲۶ھ میں یہی فتوی دیا تھا کہ حقیقی محاذات معلوم نہ ہونے
کے سبب جدہ ہی کو میقات قرار دیا جائے گا۔

امداد الفتاوی تتمہ خامسہ طبع قدیم کے ص ۱۲۹ پر اور
طبع جدید کی جلد دوم ص ۲۰۴ میں ان کا یہ ارشاد بالفاظ ذیل
منقول ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا
کہ مدینہ کا راستہ بند ہونے کی صورت میں حج کا
احرام کہاں سے باندھے گا تو اس کے جواب
میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدہ سے ہوگا۔
مناسک ملا علی قاری میں عبارت موجود ہے
وان لم یعلم المحاذات فعلی مرحلتین
من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر
اور یہ ظاہر ہے اہل ہند کے لئے یلملم کی محاذات
کسی معتبر طریقے سے نہیں ہوتی لہذا جدہ ان کے
لئے میقات ہے۔

۱۷/شعبان ۱۳۲۶ھ

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم
جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے
ہیں ان سے زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی کہ حضرت مولانا
موصوف اہل ہند کے لئے بحری جہاز سے آنے کی صورت میں
جدہ ہی کو ان کا میقات قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اقوال سابقہ
اس پر تو متفق ہیں کہ مکہ مکرمہ کی مسافت یلملم اور جدہ سے مساوی
یعنی مرحلتین ہے۔ علامہ ابن حجر مکی اس مرحلتین کو عین محاذات
قرار دے کر جدہ سے احرام کو جائز لکھتے ہیں اور ملا علی قاری اور
حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رح اس بنا پر جدہ کو قائم مقام
محاذات کا قرار دیتے ہیں کہ اصل محاذات کا علم نہیں۔ اس لئے
مسافت کا اعتبار کرکے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پہلے احرام باندھنا
واجب ہے اور جدہ چونکہ دو مرحلہ کی مسافت ہے اس لئے
جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہوگیا۔

ان تمام عبارات مرقومہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرات
فقہاء نے اس مسافت کی تعیین میں میلوں کی کمی بیشی کا اعتبار
نہیں کیا بلکہ مراحل کا اعتبار کیا ہے اور مراحل کی مسافت میلوں
کے اعتبار سے کم وبیش ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فتح الباری و
عمدۃ القاری میں بحوالہ ابن حزم یلملم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے

تیس میل لکھا ہے، اور بعض علماء نے چالیس میل بھی فرمایا ہے اور آجکل کے پیمائش کرنے والوں نے باون تک بتلایا ہے۔ پھر اسی کو سب نے مرحلتین بھی فرمایا ہے۔ اور قرن المنازل کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے مخدوم ہاشم سندھی رحنے حیات القلوب میں بحوالہ باقانی شرح ملتقی الابحر بچاس میل بتلایا ہے اور اس کو بھی تمام فقہاء نے مرحلتین ہی فرمایا ہے کما فی البحرالرائق اسی طرح ذات عرق کو بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پر لکھا ہے۔ ارشاد الساری ص ۵۵ والنووی شرح مسلم تحفہ ابن حجر مکی۔ اور میلوں میں اس کا فاصلہ قسطلانی اور فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل بتلایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ میلوں کے اعتبار سے فاصلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ تیس میل کو بھی دو مرحلے قرار دیا۔ بچاس میل کو بھی بیالیس میل کو بھی۔ اور اعتبار مراحل کا کرکے ان کی مسافتوں کو مکہ مکرمہ سے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

جدّہ کو میقات اہل یمن واہل مشرق قرار دینا اسی اصول پر مبنی ہے کہ مسافت مرحلتین پر ہے۔ اب میلوں کے اعتبار سے کتنا ہے اس کی تحقیق ضروری نہیں رہی۔ آجکل کی پیمائش کے اعتبار سے جدّہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تقریباً چھیالیس میل ہے۔

میقات یلملم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فقہاء کے نزدیک اس جگہ مسافت میں مراحل کا اعتبار ہے، میلوں کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میلوں کا فاصلہ بھی اکثر فقہاء و علماء لکھتے چلے آئے ہیں، شرح بخاری عمدۃ القاری، فتح الباری وغیرہ میں تو بحوالہ ابن حزم یہ فاصلہ تیس میل بتلایا ہے۔ اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام ص ۵۰، ج ۱ میں یہ فاصلہ چالیس میل کا لکھا ہے۔ اور آجکل بعض اہل فن نے یہ فاصلہ باون میل کا بتلایا ہے اس اختلاف کا اصل منشا موجود ہے جو تحفہ شرح منہاج کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے بتلایا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد علمت ان یلملم جبل محاذ للسعدیۃ وسمعت ان محاذاۃ السعدیۃ جبلین احدھما بین طرفھا المحاذی لمکۃ وبین مکۃ اکثر من مرحلتین والثانی ممتد لجھۃ مکۃ بینہ وبین مکۃ باعتبار طرفہ الذی یجھتھا مرحلتان فاقل

(حواشی شروانیہ ص۴۲ ج۴)

اس سے معلوم ہوا کہ یلملم اس پہاڑ کو کہا جاتا ہے جو سعدیہ کے محاذ میں واقع ہے اور وہ دو پہاڑ ہیں، ایک کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے میلوں کے اعتبار سے دو مرحلے سے زیادہ ہے دوسرے کا فاصلہ دو مرحلے سے بھی کم معلوم ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اس دوسرے فاصلہ کا اعتبار کرکے تیس میل بتلایا ہے اور جنھوں نے پہلے فاصلہ کو لیا انھوں نے چالیس بچاس میل تک کا فاصلہ قرار دیا۔ (باقی آئندہ)

تصحیح اور معذرت

رمضان ۸۸ھ کے شمارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مدیر البلاغ کی غیر حاضری کی وجہ سے دو فحش غلطیاں رہ گئیں، صفحہ ۱۵ سطر ۶، ۹ میں "بشر ابن البرا ابن ما رور" لکھا ہوا ہے، یہ اصل میں "بشر بن البراء بن معرور" ہے۔ پھر اسی صفحے پر اور اس کے بعد صفحہ ۲۰ تک عیسائی راہب کا نام "ابو عمیر" لکھا ہے یہ اصل میں "ابو عامر" ہے، قارئین تصحیح فرمالیں یقین ہے کہ ان فحش اور سامنے کی غلطیوں نے اہل علم کے ذوق سلیم کو سخت تکلیف پہنچائی ہوگی، ہم ان سب حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

ادارہ

ژاک ماری تیں ۔

تشریحی تلخیص
از
محمد حسن عسکری

خدا اور سائنس

سائنس اور مذہب کی کشمکش مغرب میں تو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، اور ہمارے یہاں بھی اس بحث نے پچھلے سو سال سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن کو بے چین کر رکھا ہے مگر اردو پڑھنے والوں کے سامنے اس مسئلے پر ایسے مغربی مصنفین کی تحریریں ابھی تک نہیں آئیں جو سائنس، دینیات، فلسفہ تاریخ اور دوسرے متعلقات سے پوری آگاہی رکھتے ہوں اور جنھیں مغرب میں بھی درجۂ استناد حاصل ہو۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے فرانس کے مشہور فلسفی اور ماہر دینیات ژاک ماری تیں Jaques Maritain کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔

ماری تیں کی عمر چھیاسی سال ہو چکی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعے فلسفہ، دینیات اور ادبی تنقید میں بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ خصوصاً رومن کیتھلک دینیات اور فلسفے کے شارح کی حیثیت سے انھیں سند کا درجہ مل چکا ہے۔ بیسویں صدی میں سینٹ ٹامس اکوائناس کے فلسفے کے احیاء کی جو تحریک Neo-Thomism کے نام سے شروع ہوئی ہے وہ اس کے سربراہوں میں سے ہیں، دوسری جنگ عظیم کے بعد سے وہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھ رہے ہیں۔

زیر نظر مضمون ان کی انگریزی کتاب On the use of Philosophy (فلسفے کا فائدہ) سے لیا گیا ہے، جو ۱۹۶۱ء میں پرنسٹن یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔ مضمون کتاب کے صفحہ ۴۸ سے صفحہ ۷۱ تک پھیلا ہوا ہے۔

یہاں ہم مضمون کا براہ راست ترجمہ نہیں دے رہے ہیں کہیں تلخیص ہے، کہیں کہیں، کہیں تشریح۔ جہاں ضروری معلوم ہوا وہاں براہ راست ترجمہ بھی ہے۔ چونکہ انگریزی کتابوں کا دستیاب ہونا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے اہم ترین عبارتیں انگریزی میں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ حوالے کی آسانی کے لئے یہ التزام کیا گیا ہے کہ جس صفحے کا مواد جہاں ختم ہوا ہے وہاں اس صفحے کا عدد شمار لکھ دیا گیا ہے۔ ضروری عبارتیں لفظ بلفظ ترجمہ ہوئی ہیں اور انھیں وادین کے درمیان رکھا گیا ہے۔ چھوٹے خطوط وحدانی (ـــ) کے درمیان جو عبارت ہے وہ مصنف ہی کے خیالات کی ترجمانی ہے۔ جہاں کہیں مزید تصریح یا تردید کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں مترجم نے اپنی طرف سے حاشیہ لکھا ہے۔ ایسی عبارتیں بڑے خطوط وحدانی [ــــ] کے درمیان ہیں۔

(مترجم)

تمہید

آجکل خارجی طور سے تو تہذیب پر سائنس ہی چھایا ہوا ہے، لیکن ذہنی اعتبار سے سائنس شدید اضطراب اور خود احتسابی کے دور میں داخل ہو چکا ہے سائنس کی دنیا میں اب جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہر سائنس داں اپنے علم کی کسی خاص شاخ میں اختصاص حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ بجائے خود ایک مسئلہ بن گئی ہے۔

(۲) نئی دریافتیں اتنی زیادہ تعداد میں ہو رہی ہیں اور نظریات اتنی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں کہ سائنس داں ہر وقت ایک مستقل بحرانی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں، بلکہ شاید یہ بحرانی کیفیت جدید سائنس کے مخصوص اندازِ نظر ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

(۳) آجکل کے سائنس داں اس خیال سے دست بردار ہو چکے ہیں کہ سائنس اخلاقیات اور مذہب کی جگہ لے سکتا ہے اور انسانی زندگی اور معاشرے کی تنظیم کرنا اور انسانوں کے لئے معیار اور اقدار فراہم کرنا سائنس کا کام ہے۔

(۴) مذہب اور فلسفہ کے بارے میں ایک صدی پہلے سائنس دانوں کا جو ذہنی رجحان تھا وہ اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ یوں تو سائنس دانوں میں بھی خدا کے منکر ہیں جس طرح دوسری جماعتوں میں ہیں، لیکن اب سائنسداں خدا کے انکار اور سائنس کو لازم و ملزوم نہیں سمجھتے۔ سائنس اور مذہب کے درمیان بنیادی تضاد کا پرانا تصور آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ امریکی سائنسداں رابرٹ ملیکن Robert Millikan نے صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کی کشمکش ممکن ہی نہیں۔ [صـ۴۴]

[یہاں ذرا سا انتباہ لازمی ہے۔ ماری تیں کے مندرجۂ بالا بیان سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آجکل سائنس مذہب کے قریب آ رہا ہے۔ اس کے برخلاف فرانس کے مسلمان عالم اور صوفی رینے گینوں یا شیخ عبدالواحد یحییٰ نے تفصیلی تجزیے کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ انیسویں صدی میں سائنس والوں کی طرف سے مذہب پر جو اعتراضات ہوتے تھے وہ تو اب ضرور ختم ہو گئے ہیں، لیکن بیسویں صدی کا سائنس حقیقی مذہب کو قبول کرنے کے بجائے جھوٹے مذاہب پیدا کر رہا ہے لہٰذا مذہب کے لئے دراصل اور بھی زیادہ خطرناک ہے]

مذہب اور فلسفے کے بارے میں آجکل سائنس دانوں کے یہاں تین قسم کے رجحان ملتے ہیں۔

(۱) بہت سے سائنس دانوں کے یہاں ایک مبہم انداز کی "مذہبیت" ملتی ہے۔ [مثلاً آئن سٹائن نے ایک طرف تو یہ کہا ہے کہ "مذہبی صداقت" Religious Truth کا فقرہ میرے نزدیک بے معنی ہے۔ اور دوسری طرف سائنسداں کیلئے "مذہبی جذبہ" Religious feeling کو لازمی قرار دیا ہے۔]

(۲) بعض سائنسدانوں کے یہاں واضح مذہبی عقیدے کی جستجو بھی نظر آتی ہے۔

(۳) نئے سائنس دانوں کو یہ فکر بھی پڑی ہوئی ہے کہ سارے علوم میں ایک فلسفیانہ وحدت پیدا کی جائے، [اور مختلف علوم ایک دوسرے سے الگ نہ رہیں جیسے آجکل ہو گئے ہیں] مگر اس جستجو میں ابھی تک عام طور سے ایک ذہنی ابہام یا دورُخا پن پایا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ بحث کہ موجودہ سائنس خدا کی معرفت حاصل کرنے میں انسان کی مدد کر سکتا ہے یا نہیں، بہت ہی نازک اور پیچیدہ بن گئی ہے۔ اس موضوع پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ سائنس کا مخصوص اندازِ نظر اور علم حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے، اور نشاۃ ثانیہ کی تحریک اور فرانسیسی فلسفی دیکارت کے بعد سے ہمارے زمانہ تک اس

انداز نظر اور طریقہ کار میں کیا نشو و نما ہوئی ہے، اور سائنس نے اپنے بارے میں کیا آگاہی حاصل کی ہے۔

یوں تو سائنس کی بہت سی شاخیں ہیں، اور ہر ایک شاخ کے الگ الگ خصائص ہیں، لیکن جدید سائنس کے ضمن میں جتنے علوم آتے ہیں ان سب کی ملکہ طبیعیات ہے۔ دوسرے علوم چاہے پوری طرح ریاضیاتی ہیئت اختیار نہ کر سکیں، لیکن کسی نہ کسی حد تک طبیعیات سے مشابہت پیدا کرنے کا میلان سب میں موجود ہے، لہذا جدید سائنس کی بحث میں سب سے زیادہ اہمیت جدید طبیعیات ہی کو حاصل ہوگی۔ [ص ۴۵]

"جدید سائنس نے ریاضی کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو فلسفے سے "آزاد" یا الگ کر لیا ہے۔ خصوصاً فلسفۂ فطرت سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید سائنس ایک خاص قسم کا علم بن گیا ہے جو اُن حقائق سے بحث کرتا ہے جنھیں حواسِ خمسہ یا آلات کے ذریعے فطرت کی دنیا سے حاصل کیا جاتا ہے، مگر اس علم کی افہام و تفہیم کلیتاً اس انداز کی ہے جیسی ریاضی کے مسائل کی ہوتی ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس نے حقیقت کے متعلق ایک مخصوص رویہ اور انداز نظر پیدا کر لیا ہے۔ اس انداز نظر کا اولین اور بنیادی وصف یہ ہے کہ سائنس داں کی حیثیت سے سائنسداں کی نگاہ میں صرف مندرجۂ ذیل چیزیں معنویت اور وقعت رکھتی ہیں۔

(۱) جس چیز کا مشاہدہ کیا جا سکے اور جسے ناپا جا سکے

(۲) وہ طریقۂ کار جس کی مدد سے مشاہدے اور پیمائش کا کام تکمیل پاتا ہے۔

(۳) مشاہدے اور پیمائش کے ذریعے حاصل ہونے والے حقائق کی از سر نو تشکیل جو ریاضی کی مدد سے سرانجام پاتی ہے، اور جس میں کم و بیش وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چنانچہ سائنس کا مخصوص دائرۂ علم بس تجربے تک محدود ہے۔ (یعنی جن معنوں میں جرمن فلسفی کانٹ نے "تجربے" Experience کا لفظ استعمال کیا ہے)۔

سائنس بعض ایسے بنیادی خیالات بھی کام میں لاتا ہے جو فلسفے میں استعمال ہونے والے تصورات سے نکلے ہیں۔ مثلاً فطرت، مادّہ یا علّیت۔" لیکن سائنس ان بنیادی خیالات کو نئے سانچے میں ڈھال کر اتنا محدود کر دیتا ہے کہ ان کا اطلاق صرف تجربے اور قابل مشاہدہ مظاہر کے دائرے میں ہی ہو سکتا ہے اور ان کا اظہار بھی صرف ریاضی کی چند معیّن علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے جنھیں الگ کر دیں تو ان خیالات کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔"

مثلاً طبیعیات کے ماہروں نے "معکوس مادے" ( ) کا تصوّر پیش کیا ہے جو صرف انھیں کے لئے معنی رکھتا ہے، عام آدمی یا فلسفی کے لئے نہیں۔ [ص ۴۶]

[مراد یہ ہے کہ فلسفے کے مسائل عام انسانی زبان میں بیان ہوتے رہے ہیں، اور اگر عام سمجھ بوجھ کا آدمی چند اصطلاحات سیکھ لے تو وہ بھی انھیں سمجھ سکتا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے جدید سائنس میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جنھیں عام آدمی تو کیا، غیر سائنس داں فلسفی بھی نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ ان مسائل کو عام انسانی زبان میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ صرف ایک خاص علم کے مخصوص علامتی رموز ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سائنس کے لئے انسانی زبان بیکار ہو گئی ہے، اور مختلف ملکوں کے سائنسداں زبان سے ایک لفظ بولے بغیر صرف اپنی رموزی علامتوں کے ذریعے آپس میں گفتگو کر سکتے ہیں لیکن کوئی سائنس داں اپنے ہم زبان لوگوں کو بول چال یا تحریر کی زبان میں سائنس کے دقیق مسائل قرار واقعی طور پر نہیں سمجھا سکتا۔ اس صورت حال سے یہ خطرہ پیدا

ہو رہا ہے کہ شاید انسانی زبان ہی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے
سائنس کے ان اثرات کا تجزیہ جارج اسٹائنر
George Steiner نے اپنی کتاب
Language and silence میں کیا ہے جو
۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ہے۔]

جدید سائنس کے ماتحت جو علوم آتے ہیں انھیں
آجکل "علم مظاہر Science of Phenomena
کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ لقب صرف اس شرط پر درست
ہوگا کہ ہم دو باتیں نظر میں رکھیں۔

(۱) یہاں جن مظاہر سے بحث ہے وہ ریاضی کی اشکال
میں تبدیل کئے ہوئے مظاہر ہیں۔
Mathematized Phenomena

(۲) یہ مظاہر ایک الگ شے نہیں، بلکہ خود اس حقیقت
ہی کا ایک پہلو ہیں جسے ہم فطرت کہتے ہیں۔

"چنانچہ ہمیں یوں کہنا چاہئے کہ سائنس واقعی فطرت
کا علم ہے، گو براہ راست نہ سہی۔ سائنس حقیقت تک
پہنچتا تو ہے، لیکن اس حقیقت کے صرف مظاہری پہلو کو
دیکھتا ہے ـــــ یعنی اس پہلو کو جس کی تعریف مشاہدے
اور پیمائش کے متعین ہوتی ہے۔ پہلے علم حاصل کرنے کے
سلسلے میں سائنس کا آلۂ کار وہ حقائق Entities
اور خصوصاً وہ ریاضیاتی حقائق ہیں جو حقیقی "real
بھی ہو سکتے ہیں اور جن کا تعلق اس "کمیت" سے ہوگا جسے
ارسطو کے زیر اثر پیدا ہونے والے حقیقت پسندانہ
فلسفے (Realizm) نے مادیاتی جوہر کا ایک
عرض بتایا ہے۔ یا پھر یہ حقائق محض مثالی اور عقلی
حقائق (Entia Rationis Axioms)
ہو سکتے ہیں۔ اور صرف علامتی رموز جن کی بنیاد مشاہدے
اور پیمائش سے حاصل کردہ حقائق پر ہو۔"

Let us say that science is a genuine, though oblique knowledge of nature; it attains reality, but in its phenomenal aspect (in other words, in the aspect of reality which is definable through observation and measurement), and by the instrumentality of entities, which may be "real" and relate to what Aristotelian realism called "quantity" as an accident of material substance, or may be purely ideal entities (entia rationis) and mere symbols grounded on data of observation and measurement."

"سائنس کو ایک عظیم الشان اختیار حاصل ہے
یعنی تجربے (Experience) سے حاصل کردہ
حقائق کی ریاضیاتی تشکیل نو کا حق۔ لیکن اس کی قیمت
یہ ادا کرنی پڑی ہے کہ سائنس کے پاس صرف مثالی اور
عقلی حقائق (Ideal Entities)
رہ گئے ہیں۔ ریاضی کی مدد سے جدید سائنس نے اپنے
آپ کو فلسفے سے آزاد کر لیا ہے۔ شروع شروع میں تو
علوم فطرت نے ریاضیات کا استعمال صرف حسی تجربے
کے دائرے میں کیا تھا۔ لیکن پچھلے سو سال کے اندر ایک
بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے پہلے تو قدیم اقلیدس
سے ہٹ کر علم ہندسہ کے نئے نظام نکلے۔ اس کے
بعد سے ریاضیاتی علوم نہایت واضح اور مکمل طور سے
انسانی تجربے کی دنیا سے الگ اور آزاد ہوتے چلے

جارہے ہیں [ص ۴۴] ان علوم کو اصرار ہے کہ بعض منطقی
اور ذہنی وجود (ens rationis) کے
دائرے میں بھی ایسے ان گنت نظام مرتب کئے جا سکتے ہیں
جن کی اندرونی ہم آہنگی کو تجرباتی طور پر ثابت کیا جا سکے۔
اور جو آزادانہ انتخاب کئے ہوئے اور باہم متغائر و متضاد اصول
موضوعہ ( ) یا مفروضات پر مبنی ہو"

Insisting on the possibility of developing in the realm of merely logical or ideal being (ens rationis) - an infinite multiplicity of demonstrably consistent systems based on freely chosen and utterly opposed "Axioms" or postulates".

نہ صرف صحیح طور پر مشاہدہ اور پیمائش کئے ہوئے حقائق جمع کر رہا ہے
بلکہ بہت سوا ایسے خیالات اور تشریحات بھی جو ہمارے ذہنوں کیلئے
حقیقی موجودات (Real Entities) کا درجہ رکھتے ہیں
مگر سائنس کا سر ایک ریاضیاتی آسمان میں پہنچا ہوا ہے جہاں علامتوں
اور محض مثالی اور ذہنی موجودات کا انبوہ ہے جن کے بارے میں ہم
وجدانی طور سے بھی نہیں سوچ سکتے۔"

یہ مثالی موجودات (Ideal Entities)
جنھیں سائنسداں کا ذہن ترکیب دیتا ہے ریاضی کے علامتی رموز
(Symbols) ہیں جن کی مدد سے سائنس خارجی
دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق تغیر و تبدل کر سکتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی جانتا ہے کہ یہ دنیا ایک نامعلوم چیز ہے۔

--- Symbols which enable science to manipulate the world, while knowing it as un-known"

"غرض اس اصول کے مطابق ریاضی کی متعدد زبانیں
وجود میں آگئی ہیں جو حقائق کو علمی تصورات میں اس طرح تبدیل
کرتی ہیں Conceptualizations
کہ ان کا مطلب صرف ریاضی داں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ زبانیں
ان موجودات (entities) سے بحث کرتی ہیں
جو صرف ذہن کے اندر ہی وجود رکھتے ہیں۔ اب سائنس خصوصاً
طبیعیات، ان مختلف زبانوں میں سے وہ زبان چھانٹ لیتا
ہے جو مظاہر کے ایک خاص مجموعے کے لئے موزوں ترین ہو
مظاہر کے دوسرے مجموعوں کو ریاضیاتی طور پر قابل فہم
بنانے کے لئے ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے تصور کی مدد درکار ہو"

یہی وجہ ہے کہ عام سمجھ بوجھ کے اعتبار سے دیکھیں
تو جدید طبیعیات کے بلند ترین اور جامع ترین نظریات میں
دنیا کی ہر چیز الٹی پلٹی ہوئی نظر آئے گی۔ "جدید علم مظاہر کے
پیر تو ضرور زمین پر جمے ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنے ہاتھوں سے
دنیا کی حقیقت جاننے کا مسئلہ ایک ایسا بلند مقام ہے، جہاں استقرائی طریقے
کے بجائے تخیل زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ "یہاں پہونچکر سائنس کو بس ایک
ہی فکر ہوتی ہے کہ دنیا کے متعدد قابل مشاہدہ پہلوؤں کا علامتی رموز کے
ایسے نظاموں میں ترجمہ کر دیا جائے جو اپنے اندر مربوط اور ہم آہنگ ہوں" [ص ۴۸]
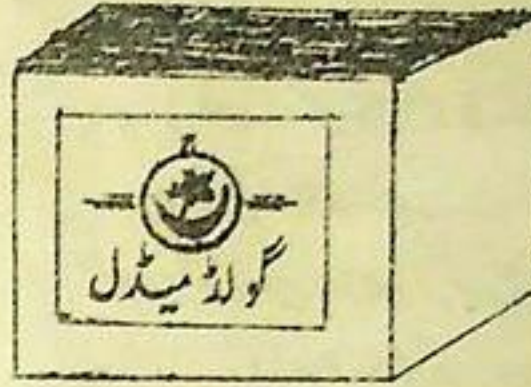
سائنسداں کو جو چیز بنیادی طور سے کام پر اکساتی ہے وہ
حقیقت کو جاننے کی خواہش ہے۔ تحقیقی کام شروع کرنے سے
پہلے اس کے ذہن کی تہوں میں یہ یقین ضرور موجود ہوتا ہے کہ کائنات
کی حقیقت ایک پُراسرار چیز ہے۔

لیکن سائنس داں کی حیثیت سے اس کا علم صرف یہاں تک
محدود ہو کے رہ جاتا ہے کہ فطرت کے جو قابل مشاہدہ اور قابل
پیمائش پہلو ہیں ان کی اور ان کی لامحدود تفصیلات کی ریاضی
کے اعتبار سے از سر نو تشکیل کرے، اور ان کو ریاضیاتی
یا نیم ریاضیاتی انداز سے سمجھ لے"

(باقی آئندہ)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی
ٹنڈو الہ یار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبوبِ نبی شبّیر علی

مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کا تذکرہ

برادرم مولوی شبیر علی مرحوم کا یہ سجع حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا بنایا ہوا ہے۔ میں نے ان کا سجع مرغوب نبی شبیر علی[1] کہا تھا، حضرت نے اس کو بدل کر محبوب نبی شبیر علی بنا دیا۔ واقعی وہ اس سجع کے مصداق تھے۔ حضرت حکیم الامت کے بھی محبوب تھے اور اپنے اساتذہ وغیرہ اقربار کے بھی محبوب تھے اور جو ان سے ملتا تھا وہ ان سے محبت کرتا تھا۔ برادرم مرحوم کی ولادت ماہ رمضان ۱۳۱۲ھ میں ہوئی جو انتقال سے ایک ماہ پہلے مجھ سے خود بیان کی تھی چونکہ کئی لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئے ماموں[2] صاحب مرحوم کو بڑی خوشی ہوئی۔ اس وقت ماموں صاحب مرحوم غالباً بانس بریلی میں ملازم تھے، یا شاہجہانپور میں۔ سُنا ہے کہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے ماموں صاحب مرحوم سے فرمایا کہ بھائی میری کوئی اولاد نہیں شبیر علی کو مجھے دے دو میں اس کو عالم بناؤں گا، انھوں نے منظور کیا اور جب وہ دس گیارہ سال کے ہوئے تھانہ بھون میں حضرت ہی کے پاس آگئے۔ اس وقت میں بھی دیوبند سے تھانہ بھون آگیا تھا ہم دونوں ساتھ ساتھ مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی سے ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں پڑھتے تھے، مولانا عبداللہ صاحب نے ہم دونوں ہی کے لئے کتاب تیسیر المبتدی لکھی تھی جس کا ہر سبق لکھ کر حضرت حکیم الامۃ کو دکھلاتے پھر ہمیں پڑھاتے تھے پھر کچھ دنوں کے بعد وہ اپنے والد کے پاس چلے گئے، غالباً خرابیٔ صحت کی وجہ سے ایسا ہوا۔ میں تو عربی پڑھتا رہا اور انھوں نے اپنے والد کے پاس یا اسکول میں انگریزی پڑھی دو تین سال کے بعد پھر تھانہ بھون آگئے، میں اس وقت کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں پڑھتا تھا اور وہ تھانہ بھون میں مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی رح سے عربی کتابیں پڑھتے تھے۔ جب میں جامع العلوم کانپور میں دینیات سے فارغ ہو کر تھانہ بھون آگیا اور وہاں سے مدرسہ مظاہر علوم میں درسیات کی تکمیل کے لئے چلا گیا مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی بھی مظاہر علوم سہارنپور میں تشریف لے آئے ان کی ساتھ مولوی شبیر علی بھی مظاہر علوم میں آگئے، وہ اس وقت عربی کی متوسط کتابیں پڑھتے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کی ان پر بہت نظرِ عنایت تھی۔ طبیعت کے بہت تیز اور ذہین تھے مگر کتابوں کے

---

[1] شبیر علی کی اضافت ایسی ہے جیسے محمود سبکتگین کی یعنی شبیر بن علی کیونکہ سجع کا ذو معنیین ہونا ضروری ہے ۱۲

[2] مولانا شبیر علی صاحب تھانوی ؒ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہم کے ماموں زاد بھائی تھے —— مدیر

مطالعہ اور تکرار میں سست تھے باایں ہمہ قرارت سب سے اچھی
اور صحیح کرتے تھے۔ جب میں مظاہر علوم میں درسیات سے فارغ
ہوتے ہی ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں مظاہر علوم کا مدرس ہو گیا
تب بھی وہ مظاہر علوم میں تعلیم پا رہے تھے، یہ یاد نہیں کہ دورۂ
حدیث مظاہر علوم میں پڑھا یا نہیں مگر انتقال سے ایک ماہ
پہلے اثنا گفتگو میں یہ کہا تھا کہ جب مولانا عنایت علی صاحب
مہتمم مدرسہ مظاہر علوم نے مجھے سند لینے کو بلایا میں نے سند لینے
سے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی تو میں نے کہا آپ تو ہر کس و ناکس
کو سند دے رہے ہیں، میرا فلاں ساتھی بالکل کودن ہے
جسے کچھ بھی لیاقت نہیں آپ اس کو بھی سند دے رہے ہیں
تو آپ کی سند قابل اعتبار نہیں۔ انھوں نے حضرت مولانا
خلیل احمد صاحب قدس سرہ سے۔ اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا،
مولوی شبیر علی سے کہدو کہ ان کو ہم خود اپنے ہاتھ سے سند
دیں گے، چنانچہ حضرت نے اپنے ہاتھ سے مجھے سند دی تو سر
آنکھوں پر رکھ لی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر علوم میں بھی
وہ دورۂ حدیث پڑھ چکے تھے، اس کے بعد دیوبند جا کر حضرت
شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے درس حدیث
میں شرکت کی اور وہاں بھی دورہ سے فارغ ہوئے۔ اس کے
بعد وہ تھانہ بھون ہی میں قیام پذیر ہو گئے۔ اس زمانہ میں
مولانا عبداللہ صاحب گنگوہیؒ تھانہ بھون سے کاندھلہ کے
مدرسہ عربی میں مدرس اول ہو کر چلے گئے تو مولوی شبیر علی نے
ان کا تجارتی کتب خانہ خرید لیا اور کتابوں کی تجارت کا
سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کی ساتھ اپنے والد صاحب کی زمینداری
کا دیکھنا بھالنا بھی شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد منشی رفیق احمد
صاحب کی شرکت میں امداد المطابع کے نام سے ایک پریس جاری
کیا اور تھانہ بھون سے ماہنامہ "الامداد" جاری کیا
میں اس وقت مدرسہ ارشاد العلوم گڑھی پختہ میں مدرس اول
تھا جب میں ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ کے اوائل میں پھر حج کو گیا
اور ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں واپس ہوا تو کاندھلہ کے اسٹیشن پر
وہ میرے استقبال کو آئے، کیونکہ وہاں شاہدرہ اور سہارنپور
سے آنے والی گاڑیوں کا میل ہوتا تھا اور اس وقت حضرت
حکیم الامۃ قدس سرہ بھی بمبئی سے ہماری ساتھ واپس آ رہے تھے
کہ ان کی اہلیہ صغریٰ بھی ہماری ساتھ حج کر کے واپس آ رہی تھیں
تو مولوی شبیر علی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں تو دراصل آپ
کے استقبال کو اسٹیشن آیا ہوں کہ اب آپ گڑھی پختہ جانے کا
خیال نہ کریں، بلکہ تھانہ بھون ہی میں قیام کریں کیونکہ مجھے
بیان القرآن کا خلاصہ کرانا ہے جو حمائل کے حاشیہ پر طبع ہوگی۔
اس وقت منشی رفیق احمد صاحب کی شرکت ختم ہو چکی تھی وہ بڑی
تقطیع کے قرآن پر پوری تفسیر بیان القرآن چھاپ رہے تھے
میں نے ان کی فرمائش منظور کر لی اور تلخیص البیان کے نام
سے خلاصۂ بیان القرآن ایک سال کے عرصہ میں مکمل کر دیا۔
مولوی شبیر علی صاحب نے اس حمائل کا کچھ حصہ تو لکھنؤ میں
چھپوایا تھا وہ تو اچھا رہا اس کے بعد عجلت کے خیال سے
ایک بڑی مشین خود خرید لائے اور اس میں بقیہ حصہ حمائل کا
طبع کیا گیا مگر جلدی کی وجہ سے وہ اچھا نہ چھپا، اس لئے کچھ
زیادہ نفع نہ ہوا تو مشین کو فروخت کر دیا۔ پھر تفسیر بیان القرآن
پر حضرت حکیم الامۃ سے نظر ثانی کرا کر مطبع مجتبائی دہلی کے
طرز پر چھاپ دی۔

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب وہ مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی
رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ خرید کر تجارت کا سلسلہ شروع کر چکے تھے
اسی زمانہ میں ان کی شادی ہوئی۔ اہلیہ گنگوہ کی رہنے والی تھیں
مگر اس وقت وہ اپنے بھائی مظہر احمد صاحب کے پاس
حیدرآباد میں تھیں، اس لئے حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ بھائی
شبیر علی کو اپنی ساتھ لے کر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔
وہاں دس پندرہ دن قیام کر کے دلہن کو اپنی ساتھ لائے
ماموں اکبر علی صاحب مرحوم نے بڑی شان سے ولیمہ کیا
ساری بستی کو دعوت دی اور جو مسافر بلا اس کو بھی ولیمہ میں
مدعو کیا گیا۔

مولوی شبیر علی صاحب کو خدا نے بہت اولاد دی مگر بچپن ہی میں اکثر کا انتقال ہوگیا۔ ایک لڑکا ظہیر علی گیارہ بارہ سال کا ہو گیا تھا میں نے اس کو صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں اور روضۃ الادب پڑھائی تھی۔ بڑا ہونہار سلیم الطبع تھا۔ جب وہ گیارہ بارہ سال کا ہوا تھانہ بھون میں طاعون شروع ہوگیا حضرت حکیم الامۃ کے ارشاد سے میں نے مسلمانوں کی تسلی کے لئے چند وعظ کہے۔ ایک وعظ میں طاعون کا شہادت ہونا بیان کر کے اس کے فضائل بتلائے تو ظہیر علی مرحوم نے باہر آکر دوستوں سے کہا کہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ مجھے طاعون ہو جائے کیسی گھڑی تھی کہ دعا قبول ہوگئی اور چند روز بعد وہ طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا، اس کے بعد اس کی بڑی بہن حلیمہ کو بھی طاعون ہوگیا جس کا نکاح مولوی شمس الحسن امام مسجد خضرا کراچی سے ہوا تھا۔ یہ دونوں صدمے یکے بعد دیگرے بڑے جانکاہ تھے مگر بھائی مولوی شبیر علی مرحوم نے بڑے ضبط و صبر سے کام لیا جس پر مجھے بہت حیرت تھی، اس ضبط کا کامل یہ اثر ہوا کہ ان کا دل کمزور ہوگیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد ان کو استسقاء کا مرض بھی ہوگیا جس کے علاج کے لئے مولانا حکیم صدیق احمد صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کو کاندھلہ جانا پڑا جس سے بحمد للہ صحت ہوگئی۔ مولوی شبیر علی صاحب نے کچھ ابتدائی عربی کتابوں کا درس بھی خانقاہ امدادیہ میں دیا ہے جب مولوی احمد حسن سنبھلی سے اہتمام خانقاہ کا کام نہ چلا تو حضرت رح نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اہتمام کا کام کس کے سپرد کیا جائے میں اس وقت ارشاد العلوم گڑھی پختہ میں مدرس تھا۔ میں نے عرض کیا مولوی شبیر علی اس کام کے لئے موزوں ہیں، فرمایا ٹھیک ہے۔ مگر اہل خانقاہ اس سے راضی ہوں گے یا نہیں؟ میں نے عرض کیا جب آپ راضی ہوں گے پھر کوئی خلاف نہ کریگا یہ زمانہ ۱۳۳۷ھ کا تھا۔

پھر غالباً ۱۳۴۲ھ میں حضرت حکیم الامۃ رح نے کلید مثنوی کو پورا کرنا چاہا دفتر اول اور دفتر ششم و ہفتم کو تو پہلے ہی پورا کر دیا تھا بقیہ دفتروں کی شرح اس طرح شروع کی گئی کہ برادرم مولوی شبیر علی اور مولانا حبیب احمد کیرانوی مرحوم سبقاً سبقاً مثنوی کا درس حضرت سے لیتے اور مولانا کی تقریر ضبط کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کرتے اس طرح شرح شبیری اور شرح حبیبی کے نام سے مثنوی کے سب دفتروں کی شرح مکمل ہوگئی۔ شرح شبیری آسان ہے اور شرح حبیبی زیادہ آسان نہیں۔ برادرم مولوی شبیر علی نے خانقاہ امدادیہ کا انتظام بہت خوبی سے انجام دیا جس کو اہل سلسلہ نے پسند کیا۔

مولوی شبیر علی مرحوم حضرت حکیم الامۃ رح کے مزاج شناس تھے، اس لئے حضرت کو بھی ان سے بہت راحت تھی، زمانۂ تحریکات خلافت میں جب حضرت حکیم الامۃ رح کے خلاف بہت شورش تھی مرحوم حضرت کی حفاظت کا بہت خیال رکھتے تھے۔

مہمات امور میں وہ بڑی ذہانت سے کام لیتے اور کامیاب ہو جاتے تھے۔ ایک بار حضرت حکیم الامۃ رح اپنے چھوٹے بھائی مولوی مظہر علی صاحب مرحوم سے ملنے علی گڈھ تشریف لے گئے کہ وہ اس وقت وہاں ملازم تھے۔ واپسی میں ان کی اہلیہ بھی حضرت حکیم الامۃ رح کی ساتھ تھانہ بھون آنے کو تیار ہوگئیں اور ماموں مظہر علی صاحب نے ان کا ٹکٹ اور زائد سامان کی رسید حضرت کے حوالہ کر دی، اور یہ نہ کہا کہ جس سامان کی یہ رسید ہے وہ ساتھ نہیں ہے بلکہ لگیج میں ہے۔ حضرت یہ سمجھے کہ جو سامان بھاوجہ کی ساتھ ہے وہی قانون سے کچھ زیادہ ہے اور یہ رسید اسی کی ہے، چنانچہ شاہدرہ اسٹیشن پر اترے تو ٹکٹوں کی ساتھ وہ رسید بھی ٹکٹ بابو کے حوالہ کر دی اور چھوٹی لائن کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بھاوجہ کو زنانہ درجہ میں سوار کرایا گیا۔ تھانہ بھون پہونچکر جو سامان ساتھ تھا بھاوجہ کے پاس بھیجدیا گیا۔ وہ یہ سمجھی کہ سارا سامان آگیا ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن انھوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لگیج کا سامان نہیں پہنچا، انھوں نے کہلا کر بھیجا کہ میرا بہت سامان لگیج تھا اس کی رسید بھی آپ کو دی گئی تھی وہ سامان کہاں ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ بھائی صاحب نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ یہ رسید لگیج کے سامان کی ہے، میں سمجھا کہ جو سامان ساتھ ہے وہی قانون سے زیادہ ہے اور رسید اسی کی ہے۔ میں نے تو ٹکٹوں کے ساتھ وہ رسید بھی بابو کو دیدی ہے۔ اب ریلوے سے مطالبہ کرنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی، چھوٹی ممانی صاحبہ بڑی پریشان ہوئیں کہ میرا تو سارا قیمتی سامان اسی میں تھا۔

حضرت نے فرمایا گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ کرو میں کچھ انتظام کرتا ہوں، یہ کہہ کر مولوی شبیر علی کو بلایا اور سارا واقعہ سنا کر فرمایا اللہ کا نام لیکر جاؤ اور شاہدرہ اسٹیشن کے گودام میں وہ سامان ہوگا، کسی تدبیر سے وصول کرلاؤ۔ مولوی شبیر علی شاہدرہ پہونچے گودام کھلا ہوا تھا وہ سیدھے گودام میں پہنچے اور اپنی چچی کے بکسوں کو پہچان کر قلی کو آواز دی کہ یہ سارا سامان اٹھالو۔ بابو نے کہا پہلے اس کی رسید دیجئے، کہا رسید آپ کو ٹکٹوں کے ساتھ مل چکی ہے، غلطی سے یہ سامان یہاں رہ گیا ہے میں اب اس کو لینے آیا ہوں، بابو نے کہا بغیر رسید دیئے آپ نہیں لے جاسکتے۔ انھوں نے ڈانٹ کر کہا کہ اپنے ٹکٹوں کو فلاں تاریخ میں دیکھو ان میں رسید نہ ملے تو مجھ سے بات کرو۔

بابو بھی تیزی میں آگیا تو مولوی شبیر علی صاحب فوراً ٹیلیفون پر جا بیٹھے اور اپنے ایک عزیز کو جو دہلی کی پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے فون کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر بابو ڈر گیا اور کہنے لگا اچھا اچھا آپ اپنا سامان لے جائیں کسی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی چچی کا پورا سامان قلی کے سر پر رکھوا کر شاہدرہ سہارنپور ریلوے کی گاڑی میں سوار ہوکر بخیریت تھانہ بھون پہنچ گئے اور سارا قصہ حضرت کو سنایا، بڑے خوش ہوئے بہت دعائیں دیں۔

ایک بار حضرت حکیم الامۃ کی بڑی اہلیہ مرحومہ نے ایک بھنگن کی لڑکی کو جو ہمارے گھروں میں کام کرتی تھی اسکی خواہش پر کلمہ پڑھا کر مسلمان کرلیا اور نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا کر اپنے پاس بٹھلالیا۔ حضرت حکیم الامۃ رح گھر میں تشریف لائے تو لڑکی کو دیکھ کر پوچھا یہ کون ہے؟ فرمایا یہ ہماری بھنگن کی لڑکی ہے، اس نے کہا مجھے مسلمان کرلو۔ میں نے غسل دلاکر کپڑے پہنا کر اسے کلمہ پڑھا دیا اور مسلمان کرلیا ہے۔ اب یہ نماز سیکھ رہی ہے۔ فرمایا تم نے غضب کیا پہلے مجھ سے تو دریافت کرلیا ہوتا ہم کسی تدبیر سے اس کے ماں باپ اور خاوند کو راضی کرکے پھر مسلمان بناتے یہ چودہ سال کی ہے اور قانون سے نابالغ ہے۔ نابالغ کے اسلام کو حکومت نہیں مانے گی، بلکہ اغوا میں شمار کرے گی مگر تم نے اس کو مسلمان کرلیا ہے تو اب تو جان جائے یا رہے اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ اب کسی طرح اسے بھنگیوں کے حوالہ نہیں کرسکتے۔ کچھ تدبیر کریں گے، اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائیں۔ پھر خانقاہ میں تشریف لاکر مولوی شبیر علی کو بلایا اور سارا قصہ سنا کر فرمایا کوئی تدبیر کرو کہ بھنگی اس سے دست بردار ہوجائیں اب ہم کسی طرح اس کو ان کے حوالے نہیں کرسکتے۔ مولوی شبیر علی مرحوم اپنے مکان پر آئے اور ملازم کے ہاتھ اس لڑکی کے شوہر کو بلایا اور کہا تیری بیوی مسلمان ہوگئی ہے، اب وہ تیرے حوالہ نہیں ہوسکتی، تیرا جتنا خرچہ اس کے نکاح میں ہوا ہو بتلادے ہم ادا کردیں گے اس نے کہا حضور میرے پچاس روپے خرچ ہوئے ہیں۔ انھوں نے فوراً بکس سے پچاس روپے نکالے اور کاغذ پر دستخط کرالئے، جس میں پہلے سے لکھدیا گیا تھا کہ چونکہ میری بیوی فلاں اپنی خوشی سے مسلمان ہوگئی ہے، اور اب میرے پاس نہیں رہ

ف یہاں سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو سیاسی تحریکات سے حضرت حکیم الامۃ رح کی علیحدگی کو بزدلی پر محمول کرتے تھے کہ جیل جانے سے ڈرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ صحیح راستہ پر مولانا کو جان کی کبھی پرواہ نہیں ہوئی۔ ہاں غلط راستہ پر چلنا اور بلا وجہ خطرہ مول لینا ان کو پسند نہ تھا۔ ۱۲ ظ

سکتی اس لئے میں اس سے دست بردار ہوتا ہوں جو کچھ
میرا خرچ ہوا تھا وہ میں نے وصول کر لیا ہے۔ اس لئے
اب میرا اس پر کوئی دعویٰ نہیں وہ جہاں چاہے رہے اور
جس سے چاہے شادی کرے۔ سرکاری ٹکٹ لگا کر شوہر کا
انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ اور حضرت حکیم الامۃ رح کے حوالہ کیا اور
کہا اب کوئی کچھ نہیں کر سکتا آپ بے فکر رہیں چنانچہ وہ لڑکی
حضرتؒ کی اہلیہ کبریٰ کے پاس ہی ایک دو سال رہی، قرآن
شریف اور بہشتی زیور وغیرہ پڑھتی رہی، پھر ملا عبدالکریم
نومسلم سے شادی کر دی گئی جو بعد میں موضع آپ تعلقہ نانوتہ
گاؤں کی مسجد کے پیش امام ہو گئے اور یہ لڑکی گاؤں کی بچیوں
کو قرآن شریف، بہشتی زیور پڑھانے لگی اور ملانی کہلانے
لگی۔

حضرت حکیم الامۃ رح سیاسی تحریکات سے الگ رہتے تھے
کیونکہ سب میں کانگریس کی ساتھ مل کر مسلمان کام کر رہے تھے
جب مسلم لیگ کو مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے کانگریس
سے الگ کر کے مستقل اسلامی پلیٹ فارم قائم کیا تو حضرتؒ
نے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلہ میں برادرم
مولوی شبیر علی صاحب نے جو کام کئے ہیں وہ رسالہ
(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی) میں مذکور ہیں۔ جو مفتی عبدالرحمٰن ہالی
صاحب چہلیک ملتان شہر نے تالیف کیا ہے اور انہی
سے مل سکتا ہے۔ حضرت حکیم الامۃ رح کی حیات میں ہی تحریک
پاکستان کا آغاز ہو گیا تھا، سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس
میں پاکستان کے نام سے تو نہیں مگر مسلمانوں کے لئے علیحدہ
حکومت کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا۔ حضرت حکیم الامۃ رح اس
مطالبہ کے دل سے حامی تھے، مگر کبھی کبھی یہ تشویش بھی ظاہر
فرماتے تھے کہ مسلمانوں کی علیحدہ حکومت تو ان صوبوں میں قائم
ہو گی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو یو۔ پی وغیرہ میں جو
اسلامی مدارس، خانقاہیں اور مساجد ہیں ان کا کیا حشر ہو گا!
میں نے عرض کیا ابتداء میں تو ان کو اسی طرح یہاں چھوڑنا ہوگا
جس طرح ہجرت مدینہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے بیت اللہ کو کفار مکہ کے قبضہ میں چھوڑ دیا تھا۔ پھر اللہ
نے چاہا تو مکہ بھی فتح ہوا اور یہ سب مقامات مسلمانوں کی
حکومت کے تحت آ گئے۔ جب تک ہندوستان پر حکومت
اسلام کا غلبہ ہو ان شاء اللہ جو مسلمان یہاں رہ جائیں گے
وہ ان مساجد و مدارس اور خانقاہوں کی حفاظت کریں گے
حضرتؒ نے فرمایا خدا کرے یہ مسلم لیگ والے علیحدہ حکومت
مل جانے کے بعد وہاں دین کو جاری کریں، بددینی کو
مٹائیں، نیک اعمال کی پابندی کریں برے کاموں سے
پرہیز کریں، تو جلد کامیابی ہو جائے گی۔ میں نے عرض
کیا آپ دعا فرمائیں کہ یہ لوگ اپنے وعدے پورے کریں
اب تک تو وہ بہت کچھ وعدے کر رہے ہیں۔ بھائی مولوی
شبیر علی مرحوم بھی مسلم لیگ کی حمایت کرتے اور مسلمانوں
کے لئے علیحدہ حکومت بن جانے کی بڑی تمنا رکھتے تھے
جب ہم نے ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد کلکتہ میں
ڈالی تو بہت خوش ہوئے۔ جب لیاقت کاظمی الیکشن شروع
ہوا میں اس وقت تھانہ بھون ہی تھا۔ سردار امیر اعظم خان
(جو اس وقت بھی بقید حیات ہیں اور پاکستان کے وزیر
بھی رہ چکے ہیں) قائد ملت لیاقت علی خاں مرحوم کا خط
لیکر میرے اور مولوی شبیر علی صاحب کے پاس پہونچے۔
پہلے مولوی شبیر علی صاحب سے ملے کہ ان کی ساتھ پہلے سے
تعارف بھی تھا اور ان کے ہی مکان پر اس وقت قیام
بھی تھا۔ جب میں خانقاہ میں نماز پڑھ کر بھائی مولوی
شبیر علی کے دفتر میں آیا تو وہاں سردار امیر اعظم سے میرا تعارف
کرایا گیا۔ پھر قائد ملت مرحوم کا خط دکھلایا۔ اور کہا
بھائی صاحب! اگر پاکستان بنانا شرعاً فرض ہے جیسا کہ
آپ تقریروں میں برابر کہتے ہیں تو اس وقت کاظمی صاحب
کے مقابلہ میں لیاقت علی خاں صاحب کی مدد کے لئے
آپ کو دورہ کرنا ضروری ہے کیونکہ کاظمی صاحب کی مدد کو

جمیعۃ علمائے ہند کے علماء بھی اپنے شاگردوں کے دورہ پر
نکل پڑے ہیں اور جن اضلاع سے ووٹ حاصل کرنا ہے
وہاں علماء دیوبند کا خصوصاً مولانا مدنی کا جس قدر اثر ہے
آپ کو معلوم ہے علیگڈھ کے طلباء بھی لیاقت علی خاں کی
مدد کو نکلے ہیں مگر ان سے مولانا مدنی کی باتوں کا جواب
نہیں ہوسکتا ان کی تو صورت ہی دیکھ کر عوام مسلمان یہ
کہدیں گے کہ تم کیا پاکستان قائم کروگے نہ صورت اسلامی
نہ شعائر اسلامی کی پابندی، اس لئے آپ کا الیکشن کیلئے
دورہ کرنا ضروری ہے۔ میں نے ان کی سفارش منظور کرلی
اور اللہ کا نام لے کر دورہ کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

بھائی مولوی شبیر علی صاحب نے جب میں دورہ کرکے
تھانہ بھون واپس آیا بڑی داد دی، میں نے کہا یہ سب
اللہ کی تائید سے ہوا ورنہ میں کیا کرسکتا تھا۔ بہرحال وہ
پاکستان کی کامیابی سے اور پاکستان بن جانے سے بہت
خوش ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ تھانہ بھون
رہے، پھر وہاں کے حالات دگرگوں دیکھ کر پاکستان کا
ارادہ کرلیا، مگر یہ ہوشیاری کی کہ ہندوستان سے براہ راست
پاکستان نہیں آئے ورنہ اپنی کسی چیز کو فروخت نہ کرسکتے۔
انھوں نے پہلے حج کا ارادہ کرلیا، ہندوستان سے مکہ آئے
اور وہاں ایک دو سال قیام کیا اس عرصہ میں ان کی زمین
وغیرہ کا روپیہ سب مل گیا تو پھر وہاں سے سیدھے پاکستان
آگئے، اول اول حیدرآباد میں قیام کیا پھر وہاں سے کراچی
آگئے، یہاں آکر کتب خانہ کی شکل میں ایک دوکان کھولدی
اور بہشتی زیور مکمل مدلل طبع کرائی۔ ناظم آباد نمبر ۲ میں اپنا ذاتی
مکان تعمیر کرلیا۔ بڑا کمال یہ کیا کہ خانقاہ امدادیہ میں جو
ضروری مسودات رہ گئے وہ سب بحفاظت مکہ لے گئے اور
وہاں سے بحفاظت تمام پاکستان لے آئے۔

مسودات اعلاء السنن کا مجھے بہت فکر تھا کہ وہ سب کے
سب خانقاہ کے کتب خانہ ہی میں محفوظ تھے۔ جب مجھے معلوم
ہوا کہ بھائی مولوی شبیر علی سب کو بحفاظت تمام اپنی ساتھ
لے آئے ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی، یہاں آکر وہ برابر
اس کوشش میں رہے کہ جو حصے اعلاء السنن کے ابھی تک
طبع نہیں ہوئے مسودہ ہی کی صورت میں ہیں جلد طبع ہوجائیں
اور ایک دفعہ پوری کتاب منظر عام پر آجائے۔ اس لئے
رنگون کے اہل خیر سے بھی خط وکتابت کی اور افریقہ
والوں سے بھی مگر کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر ہندوستان
ہی کے ایک رئیس نے جو اس وقت پاکستانی بن گئے ہیں
اس کار خیر کے لئے ہمت کی اور بارہ سے اٹھارہ تک
اعلاء السنن کی غیر مطبوعہ جلدیں چھپوادیں۔ اور انہاء السکن
مقدمہ اعلاء السنن کا دوسرا حصہ اور انجاء الوطن کا پہلا
حصہ بھی طبع کرادیا۔ نیز احکام القرآن کا حصہ اول و دوم
بھی اس ناچیز ظفر کا لکھا ہوا تھا، چھپوادیا۔ یہ سورۂ فاتحہ
سورۃ النساء کے ختم تک لکھا گیا تھا، اس کے آگے کے
حصے زیر تالیف ہیں۔ احکام القرآن کی آخری جلد مولانا
محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے لکھی ہے، وہ بھی چھپ
گئی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی دو جلدیں تالیف
کی ہیں اور زیر طبع ہیں۔

جن صاحب نے یہ حصے طبع کرائے ہیں انھوں نے
اپنا نام بھی ظاہر نہیں کیا اللہ تعالیٰ ان کے خلوص میں
برکت و ترقی دیں، خدا کرے بقیہ حصے بھی لکھے جائیں اور
ان کے طبع کا بھی انتظام ہوجائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

میں نے مرحوم کو اگست ۱۹۶۸ء کے آخر میں اطلاع
دی تھی کہ اوائل ستمبر میں کراچی آنے والا ہوں تو انھوں نے
میرے بڑے لڑکے مولوی عمر احمد کو فون کیا کہ بھائی ظفر آگئے
یا نہیں مولوی عمر اس وقت گھر پر نہ تھے، انھوں نے ٹیلیفون
پر بات کی مگر یہ نہ پوچھا کہ آپ کون صاحب ہیں جب مولوی
عمر احمد گھر پر آئے ان سے ذکر کیا کہ ایک صاحب پوچھ رہے
تھے کہ بھائی ظفر آگئے یا نہیں میں نے کہدیا کہ کل کو آرہے ہیں

مولوی عمر احمد نے کہا بھائی ظفر کہنے والا چچا شبیر علی صاحب کے سوا کوئی نہیں۔ پھر انھوں نے خود فون پر بات کی اور کہا کہ والد صاحب کل کو آرہے ہیں فرمایا ہاں مجھے ان کا انتظار رہے۔ میں اگلے دن ملنے گیا بڑے خوش ہوئے اور اعلاء السنن حصہ اول کے بارے میں گفتگو کرنے لگے کہ اعلاء السنن اور اتمام زاد الحسن کو الگ الگ چھاپنے کی ضرورت نہیں دونوں کو ملا کر ایک کتاب کر دی جائے اور اس کو اعلاء السنن کا حصہ اول قرار دیا جائے۔ جیسا حضرت حکیم الامۃ رح کا منشا تھا۔ یہ حصہ آجکل ٹائپ میں طبع ہو رہا ہے، خدا کرے جلدی طبع ہو جائے۔ پھر دعوۃ الحق کے سلسلہ میں بات ہوئی کہ مجھے اس کام کا بہت فکر ہے۔ میں نے اس کی مجلس منتظمہ میں تمہارا نام بھی لکھ دیا ہے۔ میں نے کہا جتنا مجھ سے ہو سکے گا کام کرنے کو تیار رہوں۔ پھر جب میں رخصت ہونے لگا تو پوچھا تمہاری عمر اس وقت کیا ہے، میں نے کہا ربیع الاول ۱۳۰۸ھ میں اسی سال میں آگیا ہوں۔ فرمایا میری پیدائش رمضان ۱۳۰۱ھ میں ہوئی ہے، خاندان میں مجھ سے بڑے تم ہی ہو اور سب مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میں سلام کر کے اور ان کی پوتی کو پیار کر کے رخصت ہوا اور ٹنڈو الہ یار پہنچ گیا تھا ۲۵ رجب کی رات کو ساڑھے دس بجے عزیز قاری احترام الحق سلمہ کا فون آیا کہ تائے ابا مولوی شبیر علی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اگر آپ حیدر آباد سے خیبر میل پا سکیں تو جنازہ میں شرکت ہو جائے گی۔ مگر اس وقت حیدر آباد جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ جن دوستوں کے پاس کاریں تھیں ان کو فون کیا تو کسی نے نہ اٹھایا دل مسوس کر رہ گیا اور جنازہ میں شریک نہ ہونے کا سخت افسوس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صبح ہی دار العلوم الاسلامیہ میں اعلان کر دیا کہ بھائی مولوی شبیر علی صاحب کا انتقال رات کو ۱۰½ بجے دفعۃً ہو گیا طلبہ اور مدرسین بعد ظہر مسجد مدرسہ میں جمع ہو جائیں قرآن خوانی کے بعد ان کے لئے دعا اور ایصال ثواب کریں۔ چنانچہ چار پانچ قرآن ختم کئے گئے پھر میں نے مرحوم کی مختصر سوانح حیات بیان کر کے ان کے لئے دیر تک دعائے مغفرت و رحمت کی ایصال ثواب کیا اللہ تعالےٰ قبول فرمائیں۔

مرحوم نے اپنی آخری عمر میں دو بڑے کام کئے ایک اعلاء السنن کے بقیہ حصے اور احکام القرآن کے تین حصے اور ابخار الوطن اور انہار السکن حصہ دوم کا طبع کرا دینا جس کی امید منقطع ہو چکی تھی دوسری دعوۃ الحق کا کام شروع کر دینا جس کی حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے اپنے متوسلین کو سخت تاکید کی ہے۔ جب اللہ تعالےٰ کسی بندہ کو چاہتے ہیں آخر عمر میں اسے ایسے ہی کاموں کی توفیق دیتے ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور درجے بلند فرمائے آمین۔

مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچے برخوردار مشیر علی اور منیر علی سلمہا اور دو بھائی دو بہنیں چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالےٰ سب کو صبر جمیل کی توفیق دیں۔ اور ان کے صاحبزادوں کو ان کاموں کی تکمیل کا حوصلہ دیں جو مرحوم ناتمام چھوڑ گئے ہیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

مرحوم کے انتقال سے ایک ماہ پہلے میں کراچی گیا تھا اچھے خاصے چلتے پھرتے تھے گو بوجہ سانس کی تکلیف کے کہیں آتے جاتے نہ تھے، گھر پر ہی رہتے تھے کہ زیادہ چلنے سے سانس پھول جاتی تھی۔ انتقال کے دن بھی ایسے ہی تھے۔ چار گھنٹے پہلے فون پر ناظم دعوۃ الحق سے آدھ گھنٹہ تک دعوۃ الحق کے سلسلہ میں باتیں کرتے رہے۔ مغرب کے بعد لڑکوں سے کہا مجھے نیند آرہی ہے ذرا سو رہوں، یہ کہکر لیٹ گئے اور ابدی نیند سو گئے۔

ناظم آباد نمبر ۲ کے قبرستان میں مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حکیم الامۃ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ یغفر اللہ لنا ولہ ویرحمنا وایاہ وادخلنا وایاہ الجنۃ برحمتہ وفضلہ وکرمہ وھو ارحم الراحمین۔

مرثیہ

(حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ)

یا عین جودی بدمع هاطل همل   علی حبیب جمیل الوجه والعمل
واحر قلباه من موت الحبیب ومن   بدر الجمال ببطن الارض منجدل
واحسرتاه کریم کان موضعه   بین العیون رهین الترب والجزل
واحسرتاه احیط البدر فی ظُلم   من الغمام وغاب الشمس فی ظُلل
وافرقتاه فان القلب متصدع   والعیش منکدر والعین فی هَمَل
ما کان احسنه خلقا ومکرمة   ما کان اطیبه نفسا بلا دَخَل
العلم ادّبه والحلم هذّبه   لم یُلف قط علی شتم ولا جدل
بُعدا وسحقا لدنیا لایزال بها   همٌّ یکدر صفو العیش بالخَلَل
لله در فتی قد کان منشأه   فی طاعة الله من ایامه الاول
مزین بحلی الآداب ناشرةً   مطهر من قذی الامّارة السفل
حلو الشمائل طلق الوجه مبتسما   عون المساکین محبوب الانام ولی
حر کریم سخی ماجد فطن   بر حلیم تقی غیر ذی دغل
زین العشیرة نور العین قرتها   نعم ومنطقه احلی من العسَل
لا یبعد الله من قد کان طلعته   عین الحیاة لنا بالاعین النجل
کنا نؤمل ان تبقی لنا خلفا   فکنت سلفا لنا یا خیر مرتحل
تبکی علیک عیون الناس قاطبة   مع السموات والارضین والجبل
وعد من الله ماتی علی اجل   ولات حین مناص منه بالحیل
روی الاله صریحا ضم اعظمه   بصیب من ریاض القدس منهمل
ثم الصلاة علی من کان نشأته   اصل الخلائق جرّاها من الازل
محمد خاتم النبیّاء سیدهم   واکرم الناس طرّا افضل الرسل

والآل والصحب ثم التابعین لهم
مالاح نجم علی الآفاق بالاُصُل

جریح الفؤاد ظفر احمد العثمانی التهانوی عفا الله عنه

۱۹ر شعبان سنہ ۱۳۸۸ھ

خورشید شفیع ایم اے

اسلام اور تعمیرِ اخلاق

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہے، اس عرصۂ ہستی میں جس قدر بھی مصلح اور پیغمبر آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے۔ خیرات نیکی اور چوری بُری ہے۔ لیکن اسلام اخلاقی تعلیم میں سب مذاہب سے سبقت لے گیا، دیگر انبیا اور مصلحین کی مقابلہ میں تعمیر اخلاق کے شعبہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ خود آپ کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ
الاخْلَاقِ ...... الخ
یعنی میں تو اس ہی لئے بھیجا گیا ہوں کہ
اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

(موطا امام مالک ج ۳ ص ۹۲)

اخلاق خلق کی جمع ہے .... علوم میں خلق سے مراد ایسا ملکہ ہے۔ جس کی بدولت نفس انسانی سے افعال کا صدور بغیر کسی تکلیف اور دقت کے بآسانی اور باسہولت ہوتا ہے۔ امام غزالی رح اپنی شہرۂ آفاق کتاب احیاء علوم الدین میں تحریر فرماتے ہیں، کہ خلق نفس کی اس ہیئت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام افعال صادر ہوں۔ اگر یہ افعال عقلاً اور شرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس ہیئت کو خلق بد کہتے ہیں۔ پھر امام غزالی رح لکھتے ہیں کہ اچھے اور بُرے کام کرنا یا ان پر قدرت رکھنا یا ان میں تمیز کرنا خلق نہیں کہلاتا، بلکہ خلق اس ہیئت کا نام ہے جس کی وجہ سے نفس کسی کام کو کرے یا اس سے باز رہنے کے لئے اپنے کو آمادہ پاتا ہے تو گویا ثابت ہوا کہ نفس کی ہیئت باطنی کا نام ہی خلق ہے۔

شاہ ولی اللہ رح اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ خلق انسان کی اس ہیئت کا نام ہے جو اس کے نفس کی طبیعت کے مختلف اوصاف و حالات کو جد و جہد کر کے اپنی طرف راجع کرے۔ لیکن اس سے غیر شعوری افعال مراد نہیں، اور نہ ہی اس سے جبلت مراد ہے جس میں تغیر و تبدل کا قطعی امکان نہیں۔

عقائد و عبادات کے بعد اسلام میں اخلاق کا درجہ ہے اور اسلام میں اس اخلاق سے مراد باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو بحسن و خوبی ادا کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ اخلاق کا تعلق آدمی کے ذاتی کردار کی بلندی اور اطوار کی عمدگی سے ہے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے

تو معلوم ہوگا کہ کائنات کی تمام تر خوش حالی اور سکون و اطمینان اور امن و امان اسی اخلاقِ حسنہ کی بدولت ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ادیانِ عالم کی بنیاد ہی تعمیر اخلاق پر ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا، کیونکہ جس قدر پیغمبر اور مصلح اس کائنات کے لئے مبعوث ہوئے سب کی تعلیم کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ عالمِ انسانی کے اخلاق کی تعمیر کریں، اور رسولِ اکرمؐ بھی یہی مقصد وحید لیکر اس دنیا میں تشریف لائے، اور اس بات کی تصدیق آپؐ نے خود اپنی زبانِ مبارک سے کی اور ارشاد فرمایا

بعثت لاتمم حسن الاخلاق الخ

یعنی میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں

(مسند ابن احمد)

آپؐ کی بعثت کیونکہ تکمیلِ اخلاق کے لئے ہوئی تھی، اس بنا پر آپؐ کا اعلیٰ اخلاق کا حامل ہونا نہایت ضروری تھا، چنانچہ ارشادِ ربانی اسی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

وانك لعلیٰ خلق عظیم الخ

یعنی اے رسولؐ آپ نہایت اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ (سورۃ القلم ۴)

آپؐ نے اپنی بعثت کے فوراً بعد ہی تعلیمِ اخلاق کے فرض کو انجام دینا شروع کر دیا۔ آپؐ ابھی مکہ ہی میں تھے کہ ابن ذرؓ نے اپنے بھائی کو آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا چنانچہ انھوں نے کہا

رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق

یعنی میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

ابوسفیان نے اپنی دشمنی کے باوجود ان الفاظ میں رسولِ اکرمؐ کی تعریف کی ہے (اس وقت تک ابوسفیان نے اسلام قبول نہیں کیا تھا) آپ نے فرمایا "یہ توحید و عبادات کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ پاکدامنی اختیار کریں۔"

اور جب حضرت عائشہ رضؓ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا اور پھر ارشاد فرمایا

کان خلقہ القرآن

یعنی آپؐ کے اخلاق قرآن ہیں۔

یعنی جو کچھ قرآن کریم میں مذکور ہے عین اس کے مطابق آپؐ عمل کرتے تھے، اس طرح آپؐ کا وجود قرآن کی جیتی جاگتی تفسیر تھا۔

رسولِ مقبولؐ جہاں تمام انبیاءِ کرام میں خاتم النبیین کے لقب سے نوازے گئے ہیں، وہاں کامل ترین کی صفت سے بھی متصف تھے؛ دوسرے انبیاء کی تعلیم کا فقط ایک پہلو نمایاں ہے، وہاں اس کے دیگر تمام پہلو تاریکی میں ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے صرف فوجی تعلیم نمایاں نظر آتی ہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف درگذر اور عفو کی تعلیم دیتے ہیں، مگر ان کے مقابلہ میں رسول اکرمؐ کی تعلیم زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس طرح دیگر انبیاء اور مصلحین کی وہ تمام صفات جو ان میں جدا جدا نمایاں تھیں وہ اس ذاتِ باکمال میں یکجا ہوگئیں اور اس بات کی تصدیق کردی کہ

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس میں اخلاق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے:

ان الرجال لیدرك بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل و صائم النہار الخ

یعنی انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

(بخاری کتاب الادب)

اسلام میں ایمان کا جو درجہ ہے اس سے کوئی ناواقف

نہیں، مگر اس کی بھی تکمیل اخلاق سے ہوتی ہے حدیث نبوی ہے۔

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا الخ

یعنی مسلمانوں میں ایمان کامل اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں (ترمذی)

اسلام نے اخلاق کو ہی معیار انسانیت قرار دیا ہے اور قولِ نبوی اس بات کی تصدیق کرتا ہے

خیارکم احسنکم اخلاقًا الخ

یعنی تم میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

پھر تعمیرِ اخلاق کے سلسلہ میں یہ ارشاد ہوا کہ خدا نیک خلق انسان کو پسند فرماتا ہے، اور وہی انسان اللہ کا سب سے پسندیدہ اور محبوب بندہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور حدیث نبوی اس پر دلالت کرتی ہے۔

اَحَبُّ عِبَادِ اللّٰهِ اِلَی اللّٰهِ اَحْسَنُهُمْ اَخْلَاقًا

یعنی اللہ کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

فطرتِ انسانی کی حالت ایک صاف تختی کی مانند ہے جو ہر نقش قبول کرنے کو تیار رہے اس لئے اخلاق کے خیر و شر اور تعلیم اخلاق کا اس پر بلاشبہ اثر ہوتا ہے۔ ملت کی تعمیر کا اہم اخلاق کی صحیح ترویج پر ہے۔ اسلام نے اخلاق حسنہ کے لئے ایک بلند تخیل پیش کیا اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ اسماء حسنہ کا پرتو ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہوا کہ حسن اخلاق صفاتِ الٰہی میں شامل ہیں، اس ہی بنا پر رسولِ مقبول ؐ نے صفاتِ الٰہی کو اپنانے کی ترغیب دلائی اور ارشاد فرمایا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ..... الخ

یعنی اپنے اخلاق کو خدائی اخلاق کے سانچہ میں ڈھالو

اور دوسری جگہ ساتھ ہی یہ ارشاد ہوا۔

حُسْنُ الْخُلُقِ خلق اللہ الاعظم

یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔

اسلام میں اخلاق کی خوبی اس کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ اس کے عمل میں پنہاں ہے، اس ہی لئے اسلام میں علم بلا عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور اخلاق کا کمال یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیا جائے کہ یہ خدا کے احکام ہیں، چنانچہ اسلام میں اخلاق کی قدر و قیمت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ ایک نیکی اور ہمدردی کا کام اس لئے قابل تعریف ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے۔

اسلامی عقائد و عبادات میں بھی اخلاق کی درستی کی بڑی رعایت رکھی گئی ہے، نماز جو عین عبادت ہے وہ بھی اخلاق کے سدھارنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، نماز کا اصل مقصد تو بلاشبہ اللہ کے حکم کی اطاعت ہے لیکن ایک فریضہ اور عبادت ہونے کے علاوہ نماز میں بے شمار اخلاقی فائدے بھی ہیں۔ نماز تنظیم کا سبق دیتی ہے۔ باقاعدگی ترتیب اور سلیقہ سکھاتی ہے، نماز چستی اور ہمت پیدا کرتی ہے، نماز سے پابندی اوقات اور ایفائے عہد کی عادت پڑتی ہے، نماز اخلاق کو درست کرتی اور بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ پاک اور صاف رہنے کی عادت ڈالتی ہے، نماز ہی کی وجہ سے نمازی اپنے جسم لباس اور مکان کو صاف رکھتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں اخلاقِ حسنہ کی تعمیر میں مدد دیتی ہیں۔

اسلام کا تیسرا رکن زکوٰۃ عبادت ہونے کے علاوہ تعمیر اخلاق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، دنیا کے ہر مذہب نے غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی تعلیم دی ہے۔ مگر ان تمام مذاہب کی تعلیم صرف زبانی ہے مگر اسلام ان کا عملی نمونہ بھی پیش کرتا ہے، زکوٰۃ سے اجتماعی اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے، ایک دولتمند اپنی دولت کی وجہ سے ایک غریب آدمی کو ان مختلف اخلاقی برائیوں سے بچاتا ہے، جو روپیہ پیسہ کی کمی کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ زکوٰۃ دوسری طرف انفرادی اخلاق کی اصلاح بھی کرتی ہے، اس کی ادائیگی سے انسان کا جذبۂ بخل و کنجوسی ختم ہو جاتا ہے، دولت کی محبت لالچ اور تنگدلی

دور ہو جاتی ہے، انسان کے دل میں ہمدردی اور رحمدلی پیدا ہوتی ہے، غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات کا احساس ابھرتا ہے، قومی اور اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ رح ارشاد فرماتے ہیں کہ "زکوٰۃ جہاں تزکیۂ مال کرتی ہے وہاں تزکیۂ نفس بھی کرتی ہے۔

تزکیۂ نفس اور تعلیم حکمت بھی مکارم اخلاق کا ایک زینہ ہے۔

حج جو بظاہر ایک فریضہ اور عبادت ہے مگر اس میں بھی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی تعلیم مضمر ہے۔ حج نفس انسانی میں اخوت، ہمدردی اور مدد کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک حاجی دوسرے حاجی کو باوجود مختلف اختلافات کے اپنا بھائی خیال کرتا ہے اور اس کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے

روزہ بھی عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ کردار کی تعمیر کا ایک ذریعہ ہے۔ روزہ کی وجہ سے روزہ دار کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بھوک پیاس کی شدت اور فقر و فاقہ کی تلخی کیسی ہوتی ہے۔ روزہ دار کے اندر قدرتی طور پر بھوکے پیاسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم کا بڑا واضح طریق اختیار کیا۔ اور اس کی ہر طرح سے وضاحت فرمادی، آپؐ نے تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ کر دیا، برائیوں بھلائیوں کی تمام جذبات کی وضاحت کر دی، اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید فرما دی جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ تمام ادیانِ عالم اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں مگر اسلام اخلاق حسنہ کی تکمیل کرتا ہے، جہاں دیگر مذاہب نے صرف تعلیم دی وہاں اسلام نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو انسانوں کے لئے عمدہ نمونے قرار دیا اور ارشاد باری ہوا :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ...... الخ

یعنی یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے۔

(سورۂ احزاب آیت ۲۱)

علامہ ابن القیم لکھتے ہیں کہ شریعت اسلامی نے چار قسم کے فضائل اخلاق کی تعلیم دی ہے۔

(۱) ایجابی۔ مثلاً عزم و استقلال، اقدام و شجاعت جن کے ذریعہ سے انسان اپنی مملوکہ چیزوں کی حفاظت کرتا ہے، اور جو چیزیں اس کو حاصل نہیں ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۲) اجتماعی : مثلاً دیانت و امانت جن کی انسان کو تمام معاملات میں ضرورت پڑتی ہے، اور ان کا اثر دیگر افراد پر پڑتا ہے۔

(۳) انفرادی : مثلاً قناعت ایک ایسی صفت ہے جو صرف ایک شخص کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ شریعت نے ان میں سے ہر ایک کا محل وقوع مقرر کر کے اُن کے تضاد کو دور کیا ہے۔ اسلام نے اجتماعی اخلاق کو انفرادی اخلاق پر ترجیح دی ہے۔

(۴) صلبی : مثلاً زہد و انتقار جو انسان کو معمولی حالت پر راضی رکھتا ہے۔

سید سلیمان ندویؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی میں اسلام کی تعلیمات اخلاقی کی تین اقسام مرتب کرتے ہیں۔

(۱) حقوق یعنی ایک انسان کے دوسرے انسان پر اور ان کا کرنا اس پر فرض ہے اور دوسرے الفاظ میں یہ اُن چیزوں کے حقوق ہیں۔

(۲) فضائل و رزائل، یہ انسان کے ذاتی چال چلن کی چھٹائی اور بلندی ہے، ان کا نام فضائل اخلاق اور ان کے مقابل رزائل اخلاق ہیں۔ مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رزائل ہیں۔

(۳) آداب یعنی کام کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے طور طریقے۔

مندرجہ بالا اخلاق کی اقسام بیان کرنے کے بعد جناب سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"یہ قسمیں محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی اور نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا ہے اور رزائل سے عملاً بچانا ہے۔ اس لئے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے، اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اس لئے اپنی تعلیم میں اس نے اہل کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے، اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تربیت کا ہے۔"

باوجودیکہ سید سلیمان ندوی نے اخلاق کو مختصراً دو اقسام میں بیان کیا تاہم ان کے تحت ایک طویل فہرست اخلاقیات کی مرتب کی ہے۔

قدیم حکماء کے نزدیک بھی اخلاق کی دو قسمیں ہیں جن میں یہ لوگ امہات اخلاق اور فروع اخلاق شامل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہم اخلاق کی اقسام کو مختصراً اس طرح محدود کر کے قابل فہم بنا سکتے ہیں کہ جن اخلاق کو اللہ نے پسند فرمایا ہے اور جن کا ذکر بار بار قرآن کریم میں آیا ہے، اور جن سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے وہ فضائل اخلاق میں شامل ہیں اور اس کے برعکس جو ناراضگی خداوندی کا باعث بنیں وہ رزائل اخلاق میں شمار ہوں گے۔

بیگم صدیقی

انگلستان میں ایک مسلمان بچہ

جس کے قابلِ رشک حالات بڑوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں

> مندرجہ ذیل مکتوب ایک معزز خاتون نے ـــــ جو قارئین البلاغ کی برادری میں شامل اور انگلستان میں مقیم ہیں میکلس فیلڈ (انگلستان) سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کے نام ارسال کیا ہے، اس مکتوب میں انہوں نے اپنے ایک ہونہار بچے کے حالات لکھے ہیں جو تمام مسلمانوں کے لئے سامان عبرت ہیں، اللہ تعالیٰ اس بچہ کو صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے۔ یہ مکتوب عبرت وموعظت کے بہت سے پہلو رکھتا ہے، اس لئے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے ـــــ مدیر

میکلس فیلڈ

۲۷ر جولائی ۱۹۶۸ء

معظم ومکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں اپنے بچے کے چند عجیب وغریب واقعات سپردِ قلم کر رہی ہوں یہ میرا پہلا بچہ ہے۔

..... اب یہ قریب ۹ سال کا ہو جائیگا اسے قدرتاً مذہب سے اس قدر لگاؤ ہے کہ یہاں لوگ حیران ہیں ـــــ یہاں پر اسکول میں دوپہر کا کھانا ملتا ہے، سب اسکول میں کھاتے ہیں گوشت وہی حرام ہوتا ہے۔ سور بھی ملتا ہے ہم نے اس سے صرف یہ کہدیا تھا کہ ہم کھانے کا پورا روپیہ اسکول کو دیں گے لیکن تم حرام گوشت نہ کھانا ـــــ سب ہی کہتے تھے کہ یہ حرام گوشت کھانے سے نہیں بچ سکتا، یہاں سب مسلمان کھاتے ہیں اور یہ تو بچہ ہے..... لیکن اس بچے نے کمال کر دیا، صرف اُبلے ہوئے ذرا سے آلو یا ترکاری، وہ بھی اگر گوشت سے علیحدہ ہوتی تو چکھ لیتا، اور اس گوشت میں پڑا ہوا چمچہ بھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ جب ٹیچرس نے بہت کہا تو کہدیا میں ہرگز نہیں کھاؤں گا مجھے پسند نہیں، اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ہم یہاں نئے نئے آئے تھے۔ حلال گوشت صرف مانچسٹر میں ملتا ہے، یہاں آس پاس نہیں ملتا، کیونکہ جو مسلمان ہیں وہ بھی جھٹکے کا کھا لیتے ہیں میرے بڑے بھائی دورے پر یہاں آئے تو انھوں نے لاکر دیا تھا۔ پھر وہ بھی چلے گئے تو پورے ایک ماہ تک

> "چاہے زندگی بھر گوشت نہ ملے، چاہے دال کھا کر زندہ رہوں، یا کچھ بھی نہ ملے، حرام نہیں کھاؤں گا۔"

گوشت نہیں کھایا، یہ بچہ بیحد لاڈ لا پیار میں پلا ہے اور شروع سے صرف گوشت ہی کھاتا تھا، انڈا وغیرہ کچھ نہیں کھاتا، اب گھر میں مہینے مہینے گوشت نہیں ملتا، اسکول میں ملتا ہے تو اس طرح انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چاہے زندگی بھر گوشت نہ ملے چاہے دال کھا کر زندہ رہوں چاہے کچھ بھی نہ ملے حرام تو نہیں کھاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تو ہم اس کے بندے ہیں، بھلا کیسے کھا سکتے ہیں، اور اگر اللہ چاہےگا تو ہم کو حلال کھلا دیگا۔ اس طرح ڈھائی مہینے گذر گئے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے جو انگریز ہیں ہم سے کہا کہ آپ گوشت کی تکلیف نہ اٹھائیں، میں یہودیوں کی طرح مرغی ذبح کر کے آپ کو لا کر دوں گا، چنانچہ وہ مرغی لائے اور کہا میں نے جھٹکے سے نہیں بلکہ چاقو سے ذبح کی ہے، یہ صاحب چونکہ عیسائی تھے اور اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے اس لئے ہم نے ان سے مرغی خرید لی، اس پر ہمارا لڑکا کہنے لگا کہ میں نہیں کھاؤں گا، ان عیسائیوں کا اعتبار کچھ نہیں، جب ہم نے بہت سمجھایا تو سوچ کر بولا اچھا چلئے قرآن شریف میں مجھے دکھایئے میں خود ترجمہ پڑھوں گا کہ اہل کتاب کے ہاتھ کا کھا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب اس کو قرآن کریم دکھایا اور پھر ہم نے خود کھانا شروع کیا تب وہ کھانے بیٹھا اس کے دو دن بعد کیا دیکھتے ہیں کہ مانچسٹر سے ڈاکٹر صاحب کے ایک ملنے والے ہمارے لئے بہت سا حلال گوشت اور مٹھائی وغیرہ لیکر آئے اور کہنے لگے کہ ہمیں خیال آیا کہ آپ نمازی آدمی ہیں شائد یہاں کا گوشت نہ کھاتے ہوں اس لئے ہم یہ لے آئے۔ ہم لوگوں نے بہت قیمت دینی چاہی انہوں نے وہ بھی نہ لی، جب وہ چلے گئے تو بچہ بولا دیکھا اللہ پر بھروسہ کیا تو اس نے مفت حلال گوشت دے دیا۔

ایک دن اسکول میں کسی ٹیچر نے اس سے بہت کہا کہ تم گوشت کھاؤ کیونکہ تم دبلے اسی لئے ہو کہ کم کھاتے ہو۔ یہ چپ رہا، صرف یہ کہدیا کہ میں گوشت ہرگز نہیں کھاؤں گا اور گھر آکر بولا میں کل سے اسکول میں ہرگز کھانے کے وقت نہیں رہونگا گھر آکر کھاؤں گا، پھر فوراً بھاگ کر اسکول جاؤنگا، میں نے کہا ٹھنڈ اور بارش میں اتنی دور آنا جانا مشکل ہوگا، ہاں گوشت نہ کھاؤ صرف میٹھا وغیرہ یا سبزی کھا کر وقت گزار دو، پھر آکر چھٹی میں کھا لیا کرو، لیکن وہ نہ مانا اور کہنے لگا کہ وہ اصرار کرتے ہیں اب تو میں کھانے کی میز پر ہرگز نہیں بیٹھوں گا۔ اس دن سے وہ کھانے کے وقت وہاں نہیں رکتا تھا، ایک دن بارش بہت تھی اور ٹھنڈ بھی کافی تھی ——— تو بولا اب تو اور زیادہ ٹھنڈ کا زمانہ آئیگا، خدا ایسا کرے کہ کوئی گھر اسکول کے قریب ملجائے۔ ایک ہندو ڈاکٹر کا گھر اسکول کے قریب ہے کہنے لگا یہ کسی طرح مل جائے ——— میں نے کہا بیٹے! یہ نا ممکن ہے اور کسی کے گھر کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں اس پر وہ بولا "وہ تو ہندو ہیں' ان کو کیا ہے وہ ہمارا گھر لے لیں" میں نے کہا، وہ ایسا نہیں کریں گے کہ ہمارا گھر لیکر اپنا گھر ہم کو دیدیں" تو اس پر کہنے لگا "اگر اللہ چاہے ——— ؟ آپ تو یہ کہتی کہ ہر نا ممکن کام اللہ چاہے تو ہو سکتا ہے" ——— میں بولی یہ بالکل ٹھیک ہے، اگر خدا چاہے تو ——— بھلا اب بھی انسان اللہ پر کامل ایمان نہ لائے اور اس پر بھروسہ نہ کرے تو ظلم ہے کہ اس بات کو دو ایک ہفتہ ہی گذرے ہوں گے کہ اچانک وہ ڈاکٹر سروس چھوڑنے لگے، وہ کل کہیں اور جا رہے ہیں اور اب وہ گھر ہم کو مل گیا ہے۔ اسپتال والوں نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو وہ مکان آپ لے لیں۔ بس اللہ کا کرم کیجئے۔ کہتے ہیں اللہ نظر نہیں آتا لیکن الفاظ نہیں جو کچھ کہہ سکوں اب وہ بچہ کہتا ہے دیکھ لیجئے اللہ حرام سے بچنے والوں کی کس قدر مدد کرتا ہے۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر ایک پاکستانی صاحب نے حرام گوشت کھانے سے توبہ کی ——— وہ کہتے ہیں کہ جب بچہ احتیاط کر سکتا ہے تو ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔ کوشش کریں گے کہ اب کبھی نہ کھائیں۔

میں اسکو بزرگوں کے قصے اور قرآن شریف کے معنی بتاتی رہتی ہوں، وہ بڑے ہی

دیکھئے اللہ حرام سے بچنے والوں کی کیسی مدد کرتا ہے

جناب مفتی امجد العلی صاحب

باسمہ تعالیٰ

البلاغ کے تبصرے پر تبصرہ

الرسالۃ کے مترجم کا وضاحتی مکتوب

بگرامی خدمت جناب مدیر اعلیٰ ماہنامہ البلاغ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی۔ ماہ رجب المرجب ۱۳۸۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۶ء کے ماہنامہ البلاغ میں کتاب الرسالہ کے ترجمہ پر جناب کا تبصرہ ناچیز کی نظر سے بھی گذرا، اس تبصرے کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل ایک گذارش کردینا ضروری ہے کہ کتاب کی طباعت سے قبل احقر کا خیال تھا کہ ترجمہ کے سلسلہ میں علماء حضرات کی خدمت میں بایں کلمات ایک معذرت بھی کتاب میں شائع ہو کہ علماء و اہل علم دین حضرات ترجمہ میں جس مقام پر ناچیز کی لغزش و خطا محسوس فرمائیں اس کی اصلاح فرما کر ناچیز کو ممنون فرمادیں۔ اس لئے کہ کوئی انسان خطا و نسیان سے بالاتر نہیں ہوا کرتا اور نہ یہی دعویٰ کرسکتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھا ہے وہ یقینی طور پر صحیح ہے، یا کسی مقام پر اس سے سہو واقع نہ ہوا ہے" مگر افسوس کہ یہ معذرت حسب اقرار سابق سہواً اشاعت میں نہ آسکی، اپنی بے بضاعتی کے باوجود ناچیز جتنا کچھ کرسکتا ہے، اس کو بھی خداوند بزرگ و برتر کی عظیم نعمت تصور کرتا ہے۔

(۱) جناب نے تبصرے میں ترجمہ کے صفحہ ۲۲۰ کا حوالہ دیتے ہوئے ترجمہ کی اس عبارت کو نقل فرماتے ہوئے اسکی تنقیص کا اظہار فرمایا ہے، (یہ عیب کذب بھی نہیں تصور کیا جاسکتا، تا۔ ہم اس کی حدیث کو رد کردیں) اور اس عبارت کی تصحیح اس طرح اپنے لفظوں سے فرمائی ہے (صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہئے: کہ ہم اس حدیث کو رد کردیں) اصل میں فنرد حدیثہٗ کے الفاظ ہیں۔ اس کے متعلق گذارش ہے کہ احقر کے مذکورہ ترجمہ میں کاتب سے (کہ) کا لفظ ترک ہوا ہے جو دراصل کتابت کی غلطی ہے۔ عبارت اس طرح تھی (تاکہ ہم اس کی حدیث کو رد کردیں) چنانچہ "تا" کے بعد لفظ "کہ" ترک ہوگیا اور اس کی دلیل و تصدیق مذکورہ عبارت کی دوسری سطر میں واضح طور پر موجود ہے، جس کی طرف جناب نے توجہ نہ فرمائی، یا نظر انداز فرمادیا لکھا ہے (اور یہ بھی نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس نے سچائی کے ساتھ نصیحت کی ہوگی، تاکہ، اس کی حدیث کو۔ الخ) ترجمہ کی اس عبارت میں "تاکہ" کا لفظ واضح طور پر موجود ہے، اور یہی کلمہ آپ کی پیش کردہ عبارت میں بھی، اسی طرح تھا، اور عربی عبارت (فنرد حدیثہٗ) میں، ف، کلمہ کے معنی یہی لفظ (تاکہ) پورے طور پر ادا کرتا ہے محض لفظ "تا" یا محض لفظ "کہ" پورے طور پر ادا

نہیں کرتے [۱]" اور ایسا ترک یا اضافہ کاتبوں کی جانب سے عموماً ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات مصحح کی نظر سے بھی اوجھل ہو جاتا ہے، خصوصاً جبکہ مؤلف یا مترجم خود ہی تصحیح کنندہ ہو، اپنی ذہنی روانی میں پڑھتا چلا جاتا ہے چنانچہ اس قسم کا ترک اس ترجمہ میں بعض اسی مقام پر جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، نہیں ہے، بلکہ دوسرے مقامات پر اس سے زیادہ قبیح صورت میں موجود ہے" چنانچہ ص ۱۲ سطر ۴ پر لفظ مختصر کی جگہ " خلاصہ " لکھا گیا ہے، ص ۲۶ پر آیت " وما ھو من الکتاب " کی بجائے " من الکتاب " تحریر ہے، ص ۲۹ پر " و " کی جگہ " فا " لکھا گیا ہے، ص ۴۷ پر آیت " فان کان لکم ولد " کی جگہ " لکم ولد " کتابت ہو گیا ہے، ص ۸۱ پر آیت " ویزکیکم " کے بعد پوری عبارت (ویعلمکم الکتاب والحکمۃ) متروک ہے، ص ۹۳ پر (ابی رافع) کی جگہ (ابی واضع) لکھا گیا ہے، ص ۱۴۳ پر (اللاتی ارضعنکم) کے بعد (واخواتکم من الرضاعۃ) ترک ہو گیا ہے، علیٰ ہذا القیاس۔

اب یہ تبصرہ کنندگان حضرات کے اپنے اپنے مخصوص جذبات پر منحصر ہے کہ وہ اس کو مترجم یا مؤلف یا مصنف کی طرف منسوب فرما دیں یا کاتب کی کتابت سے، کیونکہ اس نسبت کا مدار درحقیقت حسن ظن و سوء ظن پر عموماً ہوا کرتا ہے ان کے قیام کے مختلف اسباب و محرکات ہوا کرتے ہیں۔

اس کے بعد تبصرے میں فرمایا گیا ہے کہ اضافہ شدہ الفاظ میں جتنی احتیاط ضروری تھی بعض مقامات پر اتنی احتیاط ملحوظ نہیں رہی مثلاً ص ۱۵۱ پر لکھا ہے کہ: جس سنت کی شان یہ ہو گی جو میں نے بیان کی (وہاں) جو سنت (جاریہ) سامنے ہو گی اس کو جاری رکھا جائے گا، نہ اس کے بعد تبصرے میں اصل کتاب کی عربی عبارت (امضی ما سنہ) فرما کر نسخہ کی دوسری عبارت (سنۃ صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نقل فرما دی گئی ہے۔ اور پھر قوسین کے اضافہ لفظ (جاریہ) کو گمراہی کا سبب قرار دیا جانا بھی ظاہر فرمایا ہے اور اس کی وجہ جدید محققین کے نظریاتی سلسلہ اور ان کے زیر اثر کتاب کی اشاعت قرار دی گئی ہے، اس سلسلہ میں ناچیز کی گزارش یہ ہے کہ " اشہد باللہ " ترجمہ کے وقت بلکہ اس کے بعد بھی جدید محققین اور ان کے نظریہ سنت کے متعلق ناچیز کو کسی قسم کی کچھ معلومات حاصل نہ تھیں اور ان کے مطالعہ کی طرف کبھی توجہ ہی کی تھی اور نہ اس سلسلہ میں کسی سے تبادلہ خیال کا موقعہ پیش آیا تھا، احقر نے اپنے ایک مخصوص نظریہ کے تحت اس لفظ کا اضافہ کیا تھا، وہ یہ کہ میرے نزدیک کتاب کی ہر دو مذکورہ عبارت (سنۃ صلے اللہ علیہ وسلم) اور (امضی ما سنہ) کا مطلب اس مقام پر محض یہ تھا کہ جس طریقہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما کر اس پر عمل جاری چھوڑا ہو تاکہ امت آپ کے اس جاری شدہ عمل کی اتباع کرتی رہے اس کو اسی طرح جاری رکھا جائیگا " اس لئے کہ اس جملہ سے قبل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ ۵۰۸، ۵۰۹ و ۵۸۲، وغیرہ کی عبارتیں (ولیست فی الشیٔ سنۃ) اور (ولیس سنۃ فی نص معناہ) اور (ولیست السنۃ ثم ثم یلبسہا بسنۃ) اسی معنی کو ظاہر کرتی ہیں جس کو میں نے پیش کیا ہے "، اس مقام کے ترجمہ میں احقر کا ذہن تمام عوارض خارجیہ سے بالکل صاف و سادہ تھا اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پورے کلام کو ان کی منشاء کے مطابق (جو احقر سمجھ سکا) پیش کرنا مقصود تھا اور ہے، اس سے قطع نظر کہ دوسرے کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں " اگر اس ترجمہ کو ایک خالی الذہن انسان مطالعہ کرے گا تو مجھے انشاء اللہ یقین ہے کہ میرے معروضہ کے

---

[۱] ہماری رائے میں مفتی صاحب کا یہ فرمانا درست نہیں ہے۔ " نفی کے جواب میں جو ف آتی ہے، اس کا صحیح ترجمہ صرف " کہ " ہے، " تاکہ " نہیں مثلاً ما رأیتک فاکلمک کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: " میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں کہ تم سے بات کرتا " یہاں " کہ " کے بجائے " تاکہ " کا لفظ غلط ہوگا ——— مدیر

ماسوی اور کچھ نہ بھیگا، البتہ جو اذہان خارجی علتوں کی بنا پر معلول ہو چکے ہیں وہ اپنی اپنی کیفیت طاریہ کے تاثر سے جو کچھ نہ سمجھیں وہ تھوڑا ہی ہے۔

لفظی فروگذاشتیں

یعنی فحا برہ کے ساتھ بیع کے لفظ کا الحاق اس کے متعلق احقر یہ تسلیم کرے گا کہ یہ احقر کی روانی قلم یا لغزش قلم کا نتیجہ ہے، یا بعبارت دیگر استغراق ذہنی کا کارنامہ ہے جس کی تصحیح آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ ہو جائے گی،

تشریح حواشی اور تدلیس کی تعریف

جہاں تک احقر کا خیال ہے نوٹ کی عبارت پیش اس حد تک تھی (حالانکہ سماع حاصل نہ ہو) اس کے بعد کی عبارت قلم زدہ تھی۔ چونکہ اس موقعہ پر ذہن میں امام نووی کے مقدمہ شرح مسلم کی عبارت سے پیدا شدہ مسئلہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے فصل تدلیس میں تدلیس کی تعریف اور اس کے اقسام بیان فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے ثم قال: فریق من العلماء من عُرِفَ منه هذا التدليس صار مجروحا لا یقبل له روایة فی شیٔ ابدا وان بیّن السماع)[1] ہو سکتا ہے کہ نوٹ میں اس کی وضاحت کرنا مقصود ہو لیکن پھر کسی خیال کے تحت لکھتے لکھتے اس کو ترک کر دیا گیا ہو اور جو لکھا تھا قلم زد کیا گیا ہو، چنانچہ احقر کی تالیف "الدرایہ فی اصول الحدیث مطبوعہ قرآن محل) جو اس ترجمہ سے قبل شائع ہوئی ہے اس کے صفحہ ۹۳ - ۹۴ پر حدیث مدلس کی تعریف اور اس کے اقسام اسی طرح بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ تبصرے میں فرمایا گیا ہے۔ اور اسی اختلاف کی بنا پر احقر نے یہ نہیں لکھا ہے کہ (حدثنی وسمعت فلانا) کہنے سے "بالاتفاق حدیث مقبول ہوگی"

بہر صورت احقر آپ کا بہت بہت ممنون ہے کہ جناب نے ان لغزشوں پر تنبیہ فرما دی۔ اور ساتھ ہی گذارش کرتا ہے کہ (ظنوا بالمؤمنین خیرا) والسلام

احقر امجد العلی عفی عنہ
اورنگی آباد ۱۵/۷/۷۷ کراچی

البلاغ

جناب مفتی امجد العلی صاحب کا یہ مکتوب اس لئے شائع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین البلاغ "الرسالۃ" پر تبصرے کیساتھ مفتی صاحب کی وضاحت کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ ہم نے اپنے تبصرے میں جن فروگذاشتوں کی نشاندہی کی تھی، جناب مفتی صاحب نے ان میں سے بعض کا جس طرح اعتراف فرمایا ہے، وہ انکی دیانت کی واضح دلیل ہے، نیز انھوں نے "سنت جاریہ" کا جو مفہوم بتایا ہے اور "جدید محققین" کے رسولئے زمانہ "نظریہ سنت جاریہ" سے جس طرح اپنی برارت کا اظہار فرمایا ہے وہ نہایت قابل قدر ہے، خود ہمیں بھی یہ گمان نہیں تھا کہ مفتی صاحب اس نظریہ سے متفق ہوں گے، اسی لئے ہم نے تبصرے میں ان پر اس نظریئے کے قائل ہونے کا الزام نہیں لگایا تھا۔ بلکہ صرف یہ گذارش کی تھی کہ جس ماحول میں یہ کتاب شائع ہو رہی ہے اس کے پیش نظر یہاں "سنت جاریہ" کا لفظ خلاف احتیاط ہے۔ اس سے غلط مطالب کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے اور اٹھانے والے اس سے غلط فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ہماری رائے یہ ہے کہ مفتی صاحب اس مقام پر ایک توضیحی نوٹ کا اضافہ فرمادیں تاکہ بات بالکل صاف ہو جائے۔

مکتوب کے بین السطور مفتی صاحب نے اشارۃً تبصرہ نگار پر اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ اس کا مقصد "تنقیص" تھا اور اس نے غیر جانبداری کے ساتھ تبصرہ کرنے کے بجائے کچھ "خارجی علتوں" سے متاثر ہو کر یہ باتیں لکھ دی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مفتی صاحب کا یہ تاثر خود ان کی گرانقدر نصیحت "ظنوا بالمؤمنین خیراً" کے خلاف ہے۔ تبصرہ نگار کی ایک مشکل یہ ضرور ہوتی ہے

---

[1] مقدمہ نووی شارح مسلم جلد اول ص ۲۲ مطبوعہ مصر۔ مطبعہ مصریہ دکتبتہا موسسہ ۱۹۲۴ء

کہ اسے اچھی باتوں کی تعریف کے ساتھ ان امور کی نشان دہی بھی کرنی پڑتی ہے جو اس کی نگاہ میں غلط، نامناسب یا خلاف احتیاط ہوں۔ ہم اپنی دانست میں پوری دیانت داری کے ساتھ تصویر کے دونوں رُخ سامنے لاتے ہیں، اور بحمداللہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس میں تحزب کا کوئی عکس شامل نہ ہو اور تنقید کہیں تنقیص کی حد تک نہ پہنچے، اگر مفتی صاحب تبصرے کے تعریفی اور تنقیدی جملوں کا حقیقت پسندانہ موازنہ فرمائیں گے تو انشاء اللہ یہ موازنہ ہمارے اس طرزِ عمل کی گواہی دے گا ——— مدیر

دینی مدارس کے طلباء کے لئے خوشخبری!

دارالعلوم میں تخصص فی الفقہ کا اجراء

نصاب اور نظام کی تفصیلات کے لئے دیکھئے البلاغ کا شمارہ شعبان ۱۳۸۸ھ

شرائط داخلہ

(۱) اس شعبہ کے لئے صرف وہ طلبہ اپنی درخواستیں ارسال کریں جو:

(الف) کسی معروف دینی درسگاہ سے اعلیٰ درجہ میں فارغ التحصیل ہوں۔

(ب) اردو تحریر و انشاء کی اچھی صلاحیت کے حامل ہوں۔

(ج) فقہ اور اصولِ فقہ میں خصوصی استعداد و مناسبت رکھتے ہوں۔

(۲) تقریری امتحان داخلہ مندرجہ ذیل کتابوں میں لیا جائے گا۔

بیضاوی یا جلالین۔ صحیح بخاری۔ ہدایہ کامل۔ شرح عقائد۔ مختصر المعانی۔ مقامات حریری سلم العلوم اور میبذی۔ اس کے علاوہ اردو تحریر و انشاء کی صلاحیت کا بھی امتحان کیا جائے گا۔

وظیفہ

جو طلباء امتحانِ داخلہ میں کامیاب ہو کر اس شعبے میں داخل ہوں گے، انھیں فراغت تک پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائیگا داخلے ۱۵ شوال ۱۳۸۸ھ سے شروع ہو کر یکم ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ کو ختم ہو جائیں گے۔ بہتر ہے کہ خواہشمند طلباء دارالعلوم آنے سے قبل ہی اپنی درخواستیں ارسال کردیں درخواستیں اس پتہ پر بھیجی جائیں:

مولانا قاری رعایت اللہ صاحب ناظم اعلیٰ دارالعلوم، کورنگی کراچی ۱۴

افادات: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم
ضبط و ترتیب : ادارہ

دل کی دنیا

مقامِ توحید

جن اعمالِ باطنہ کو حاصل کرنا انسان کے ذمہ ضروری ہے، ان میں سے ایک "توحید" ہے۔ توحید کا ایک مفہوم تو آپ نے علمِ عقائد میں پڑھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کو ایک ماننے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے یہ توحیدِ اعتقادی ہے جس پر انسان کا ایمان موقوف ہے اور اس کے بغیر انسان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا ———

لیکن علمِ تصوف میں "توحید" سے مراد "توحیدِ عملی" ہوتی ہے جو توحیدِ اعتقادی سے اگلا درجہ ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ "توحیدِ اعتقادی" میں جس عقیدے کو علمی طور پر حاصل کیا گیا تھا، اسے عملی طور پر اپنا "حال" بنا لیا جائے یعنی ہر آن اس حقیقت کو نگاہوں کے سامنے رکھا جائے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف اللہ کی ذاتِ واحد سے ہو رہا ہے۔ اس دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں وہ سب اللہ ہی کی طرف سے آتے ہیں اور اس کی مشیت کے بغیر کوئی ذرہ اِدھر سے اُدھر حرکت نہیں کر سکتا عقیدے کی حد تک تو اس بات کو ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے، لیکن ہر رنج و راحت اور غم و مسرت کے وقت اس حقیقت کا استحضار نہیں رہتا، اس لئے جب کسی ظاہری ذریعے سے کوئی خوشی یا تکلیف پہنچتی ہے تو آدمی اسی ظاہری ذریعہ کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور خوشی اور تکلیف دونوں کی نسبت اسی کی طرف کرتا ہے۔ لیکن "توحیدِ عملی" کا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہر آن اس طرح مستحضر رکھے گویا اس کو دیکھ رہا ہے، اسی کو بعض بزرگوں نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ:

"توحید خدا واحد دیدن بود، نہ واحد گفتن"

یکے داں، یکے خواں، یکے بیں، یکے گو

جب انسان کائنات کے ہر واقعے کے پیچھے ہر آن خدائے واحد ہی کو دیکھتا ہے تو وہ لوگوں کی دشمنی اور دوستی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ جو راحت یا تکلیف اسے پہنچی ہے وہ تمام تر خدا ہی کی طرف سے ہے، اور جو انسان ظاہری طور پر اس کا سبب نظر آ رہا ہے، وہ محض ایک واسطہ ہے، اس سے زائد کچھ نہیں ؎

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست
کہ دلِ ہر دو در تصرفِ اوست

سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ جب آپؐ کے سامنے کوئی ناگوارِ طبع بات پیش آتی تو زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمانے کے بجائے صرف اتنا فرمایا کرتے تھے

کہ ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لا یکون (جو کچھ اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو کچھ وہ نہیں چاہے گا وہ نہیں ہو گا) اور حقیقت یہ ہے کہ رنج و تکلیف کے موقعہ پر تسکین قلب کا اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تمثیل کے ذریعے اس بات کو سمجھایا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے تلوار پر دعویٰ کیا کہ تو نے مجھے مارا ہے، اس نے جواب میں کہا کہ میں کون ہوں! مجھ میں کیا طاقت تھی؟ مجھے تو ہاتھ نے استعمال کیا، دعویٰ کرنا ہے تو اس پر کرو، اس شخص نے ہاتھ پر دعویٰ کیا تو اس نے کہا کہ میرا کیا قصور! میں تو بے حس و بے شعور تھا، یہ "ارادہ" تھا جس نے آکر مجھے جگایا اس لئے لڑنا ہے تو اس سے لڑو، اس نے "ارادہ" پر دعویٰ کیا تو اس نے کہا میں کیا چیز ہوں؟ مجھے تو دل نے اس حرکت پر برانگیختہ کیا تھا، دل کے پاس پہنچا تو وہ بولا کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میں تو کسی اور کے قبضۂ قدرت میں ہوں، القلوب بین اصبعی الرحمٰن! اس طرح انجام کار تمام حرکات کی انتہا ایک ہی فاعل حقیقی پر ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اللہ تبارک تعالیٰ

بس یہی وہ حقیقت ہے جس کا استحضار "توحید عملی" کو مطلوب ہے، اور جب انسان توحید کے اس مقام کو بدرجۂ اتم حاصل کر لیتا ہے تو نہ اس کے دل میں کسی کی خوشامد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نہ وہ چاپلوسی کرتا ہے نہ وہ خدا کے سوا کسی سے ڈرتا ہے، نہ مال و دولت کی لالچ اسے کسی کام پر آمادہ کر سکتی ہے اور نہ جان کا خوف، اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

موحد! چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نہ باشد ز کس
ہمیں است بنیادِ توحید و بس

اس لئے کہ وہ اس حقیقت کو صرف جانتا ہی نہیں کھلی آنکھوں دیکھتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر مجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے، اور سارے جہاں کی مخلوقات جمع ہو کر مجھے کوئی زک دینا چاہیں تو نہیں دے سکتیں، اس لئے میں کسی سے کیوں ڈروں؟ اور کسی خوف یا کسی لالچ کا شکار کیوں بنوں؟ چنانچہ وہ اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی کے سامنے جھکتا ہے نہ کسی کی خوشامد کرتا ہے، نہ کسی سے کوئی ایسی امید باندھتا ہے جس کی خلاف ورزی سے اسے تکلیف پہنچے! بس وہ تو ایک ہی ذات کے ساتھ تعلق میں مست ہے، اور اس کا نعرہ یہ ہے کہ ع

یکے داں، یکے خواں، یکے بیں، یکے جُو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقام حاصل کیسے ہو؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اعتقاداً توحید کا یقین تو ہوتا ہے، لیکن چونکہ انسان کی نگاہیں ظاہری وسائط کے خم و پیچ میں الجھی رہتی ہیں: اس لئے اس یقین پر کچھ اوہام مسلط ہوتے رہتے ہیں، اس کی مثال بقول امام غزالیؒ ایسی ہے جیسے ایک مردہ انسان کی لاش کے بارے میں ہر انسان کو کامل یقین ہوتا ہے کہ یہ جماد ہے، اس میں کوئی شعور نہیں، یہ از خود حرکت نہیں کر سکتی، لیکن اس یقین کے باوجود انسان اس لاش کے ساتھ ایک ہی بستر پر سونے سے وحشت محسوس کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لاش کے بے جان ہونے کا قائل نہیں، بلاشبہ وہ اس کے بے جان ہونے کا قائل ہے، لیکن کچھ اوہام اس کے ذہن کو پریشان کرتے ہیں۔

بس! اسی طرح ہر مسلمان ان ظاہری وسائط کو بے بس تو سمجھتا ہے مگر اس کے قلب میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ اوہام کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دے۔ اگر قلب میں یہ قوت پیدا ہو جائے تو "توحید عملی" کا مقام خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ حضرت مجذوبؒ فرماتے ہیں ؎

کچھ بھی مجنوں! جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے
تو نے لیلیٰ جسے سمجھا ہے وہ محمل ہو جائے

قلب کی یہ قوت "مراقبات" کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جب انسان یکسوئی کے ساتھ روزانہ واقعات عالم پر نظر کرتا ہے، اور یہ دیکھتا ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے منصوبے کس طرح روزانہ خاک میں مل جاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ اس کے دل سے اوہام کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور "عقیدہ توحید" اس کی رگ رگ اور پے پے میں سرایت کر کے اس کا "حال" بننے لگتا ہے۔ ہاں! ان مراقبات میں کسی شیخ کامل کی رہنمائی کی ضرورت ہے، تاکہ وہ انسان کو افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے روکتا رہے۔

افراط و تفریط کے سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں، ایک تو یہ کہ اگرچہ اس کائنات میں ہر خیر و شر کا خالق اللہ تعالٰے ہے، اور انسان کو راحت بھی اسی کی طرف سے پہنچتی ہے اور تکلیف بھی لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خیر کے جزئیات کی نسبت تو اللہ کی طرف کرے لیکن شر کے جزئیات کی نسبت اس کی طرف نہ کرے، قرآن عزیز کا ارشاد ہے کہ:

"مایفتح اللہ من رحمۃٍ فلا ممسک لھا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہٖ"

اللہ جس رحمت کو کھول دے تو اسے بند کرنے والا کوئی نہیں اور جس چیز کو بند کر دے اسے اسکے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں۔

یہاں باری تعالٰی نے کھولنے کے ساتھ تو "رحمت" کا ذکر فرمایا ہے، مگر بند کرنے کے ساتھ "رحمت" کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ وہاں "جس چیز" کے الفاظ ہیں، اس "چیز" کی تشریح نہیں فرمائی اس میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ رحمت کو بند کرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرنا خلاف ادب ہے، اور اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ جو چیز بظاہر خلاف رحمت نظر آتی ہے، وہ بھی کائنات کے تکوینی مصالح کے پیش نظر رحمت ہی ہوتی ہے۔

اسی طریقے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار فرمایا قرآن کریم میں ہے کہ وہ تمام اچھی چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کرتے رہے کہ وہ مجھے ہدایت دیتا ہے، مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور اس کے بعد فرمایا کہ:

واذا مرضت فھو یشفین

اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

یہاں شفا دینے کی نسبت اللہ کی طرف فرمائی، اور مرض کی نسبت خود اپنی طرف کی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے ایک جگہ تو فرمایا کہ فأراد ربک ان یبلغا اشدھما ... خیراً منہ زکوٰۃ واقرب رحما - یہاں اچھی بات کے ارادے کی نسبت اللہ کی طرف فرمائی، لیکن کشتی کے قصے میں فرمایا "فأردت أن أعیبھا" یہاں چونکہ "عیب" کا لفظ آگیا تھا، اس لئے اس کی نسبت خود اپنی طرف فرمائی۔

اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالٰے کے لئے صرف "خالق الکلاب والخنازیر" کے الفاظ استعمال کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ کائنات کے تمام واقعات میں فاعل و مؤثر حقیقی اللہ ہی کی ذات ہے لیکن اسلامی شریعت نے ظاہری وسائط کو دنیوی احکام میں بالکل خارج از بحث قرار نہیں دیا، بلکہ ان کے بھی کچھ حقوق رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فاعل حقیقی تو بلا شبہ اللہ ہی ہے۔ لیکن اللہ نے جس چیز کو فعل کے وقوع کے لئے واسطہ بنایا اس کا بھی ایک مقام ہے چنانچہ اگر کوئی شخص آپ پر کوئی احسان کرے تو اس کا شکر ادا کرنا بھی آپ پر واجب ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے علماء نے لکھا ہے کہ حصول علم کے جو آلات ہوتے، مثلاً قلم، دوات اور کاغذ وغیرہ، طالب علم کو ان کا بھی احترام کرنا چاہئے البتہ ان وسائط کو کس حد تک ملحوظ رکھا جائے؛ اور کہاں ان سے صرف نظر کر لیا جائے؟ یہی وہ باریک فرق ہے جو "توحید عملی" کی راہ پر چلنے والے کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، اور عملاً اسکی حدود کا تعین کسی شیخ کامل کی رہنمائی ہی سے ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری
استاذ دار العلوم کراچی ۱۴

خواتین اسلام

سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں

حدیث نمبر ۲۴

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ اَوْمَتْ اِمْرَأَةٌ مِنْ وَرَاءِ سِتْرٍ بِيَدِهَا كِتَابٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهٗ فَقَالَ مَا اَدْرِيْ اَيَدُ رَجُلٍ اَمْ يَدُ امْرَأَةٍ قَالَتْ بَلْ يَدُ امْرَأَةٍ قَالَ لَوْ كُنْتِ امْرَأَةً لَغَيَّرْتِ اَظْفَارَكِ بِالْحِنَّاءِ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۸۳)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ ایک عورت کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا، اس نے پرچہ دینے کے لئے پردہ کے پیچھے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ بڑھایا، آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور فرمایا کہ نہ معلوم مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا، اس نے کہا کہ یہ عورت کا ہاتھ ہے! فرمایا اگر تو عورت ہوتی اپنے ناخنوں کو مہندی کے ذریعہ بدل دیتی (یعنی مہندی سے رنگ لیتی) (مشکوٰۃ شریف)

تشریح: اس حدیث سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ صحابی عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پردہ کرتی تھیں اسی لئے تو ایک عورت نے پردہ کے پیچھے سے پرچہ دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اگر بے پردہ سامنے آتیں تو پردہ کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے ان جاہل پیروں کی گمراہی معلوم ہوئی جو اپنی مرید عورتوں میں بے محابا اندر گھروں میں گھس جاتے ہیں اور پردہ کا اہتمام نہیں کرتے، جاہل عورتیں کہتی ہیں کہ ان سے کیا پردہ! پیر میاں ہیں نیک آدمی ہیں! بھلا اللہ کے پاک رسول فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون نیک اور پارسا اور پاکباز ہوگا؟ جب صحابی عورتوں نے آپ سے بھی پردہ کیا تو کسی دوسرے کو دم مارنے کی کیا مجال ہے جو نیکی کے جھوٹے دعوے کرکے بے محابا عورتوں میں چلے جاتے ہوں، ایسے لوگ پیر و مرشد نہیں بلکہ گمراہ ہیں جو شیطان کی راہ دکھاتے ہیں، ایسے لوگوں سے مرید ہونا حرام ہے مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، ہمارے دادا پیر حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے پیر تھے، جب عورتوں کو مرید کرتے تھے تو پردہ ڈال کر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بغیر توبہ پڑھا دیتے تھے لیکن توبہ کے الفاظ کہلواتے وقت پردہ کو پشت کرکے بیٹھتے تھے تاکہ غلطی سے بھی نظر نہ پڑ جائے اور عورتیں اپنی تاک جھانک والی عادت سے بھی باز نہیں آتی ہیں

اس لئے ایسا کرنا ضروری ہوا، کسی موقعہ پر ایک عورت نے عرض کیا کہ حضرت جب پردہ ڈال لیا تو منہ پھیر کر بیٹھنے کی کیا ضرورت رہی ؟ فرمایا تم کو کیا معلوم میرا منہ کدھر کو ہے پتہ چلا کہ باوجود پردہ کے احتیاط لازم ہے کیونکہ تم نظر ڈالنے میں بے احتیاط ہوتی ہو، دیکھو اچھے اور سچے پیر ایسے ہوتے ہیں جو پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں اور مریدوں و مریدنیوں کو بھی اسی پر چلاتے ہیں۔

بہت سے لوگ بڑی بڑی لڑکیوں بلکہ اچھی خاصی عمر کی جوان عورتوں کو ماسٹروں یا حافظوں سے بطور ٹیوشن پڑھواتے ہیں اور پردہ کا بالکل خیال نہیں کرتے پڑھانے والا استاد اور پڑھنے والی لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھکر بلا پردہ پڑھتے پڑھاتے ہیں اور نہ صرف بے پردہ بلکہ خلوت اور تنہائی بھی ہوجاتی ہے۔ بعض مرتبہ وہاں کوئی تیسرا نہیں ہوتا یہ سب حرام ہے۔ استاد یا پیر اگر غیر محرم ہو تو پردہ لازم ہے خوب سمجھ لو۔ دوسری بات حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ عورت کو عورتوں والی وضع میں رہنا چاہئے عورت کے ہاتھ میں مہندی ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ یہ عورت کا ہاتھ ہے چاہیے تو یہ کہ عورت ہاتھ کی ہتھیلیوں پر مہندی لگاتی رہی ورنہ ناخنوں میں تو ضرور ہی مہندی رہتی چاہیے، مرد کو اپنی وضع مردانہ میں اور عورت کو اپنی وضع زنانہ میں رہنا چاہیے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا خاص اہتمام تھا اور ایک کو دوسرے کی وضع اور لباس پہننے سے منع فرماتے تھے جس کا کچھ بیان ابھی دوسری حدیثوں کی تشریح میں آئے گا، انشاء اللہ تعالے۔

مسئلہ: نیل پالش کے نام سے ایک سرخی آتی ہے اسکو ناخن پر لگاتی ہیں تو اس کا رنگ نہیں بلکہ جسم ناخن پر چپک جاتا ہے اسکے ہوتے ہوئے وضو اور غسل درست نہیں ہوتا لہٰذا اس کا استعمال کرنا سخت منع ہے۔

حدیث ۲۵

وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ قِیْلَ لِعَائِشَةَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا اِنَّ امْرَاَۃً تَلْبَسُ النَّعْلَ قَالَتْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَاءِ (رواہ ابوداؤد) (مشکوٰۃ ص۳۸۳)

ترجمہ: حضرت ابن ابی ملیکہ (تابعی) کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے عرض کیا کہ ایک عورت (مردانہ) جوتا پہنتی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں کے طور طریق اختیار کرے (مشکوٰۃ شریف)

تشریح: یعنی جو عورت لباس اور وضع قطع اور سج دھج میں مردانہ طرز کو اپنائے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی۔

حدیث ۲۶

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ یَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْاَۃِ وَالْمَرْاَۃَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ۔

(رواہ ابوداؤد) مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرد پر لعنت کی جو عورت کا لباس پہنے اور ایسی عورت پر لعنت کی جو مرد کا لباس پہنے۔

(مشکوٰۃ شریف)

حدیث ۲۷

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَىٰ عَنْهُمَا قَالَ لَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالَىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ أَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ۔

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۸۰)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالے عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ان مردوں پر جو عورتوں کی طرح شکل وصورت بناکر ہیجڑے بنیں اور لعنت کی ان عورتوں پر جو شکل وصورت میں مردانہ پن اختیار کریں اور ارشاد فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے نکالدو (مشکوٰۃ شریف)

تشریح: ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے پیارے رسول صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس بات سے بہت ہی زیادہ نفرت تھی کہ مرد زنانہ لباس پہنیں یا اور کسی طرح سے زنانہ پن اختیار کریں اور اس بات سے بھی آپ کو سخت نفرت تھی کہ عورتیں مردانہ لباس پہنیں یا مردانہ چال ڈھال اختیار کریں، اور اسی نفرت کے باعث اس کے مردوں اور عورتوں پر آپؐ نے لعنت فرمائی، درحقیقت عقل کا بھی تقاضا یہی ہے کہ مرد، مرد بن کر رہیں اور عورتیں عورتیں بنی رہیں، آجکل کے لوگ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہدایت کو نہیں دیکھتے بلکہ یورپ امریکہ کے کافروں اور سنیما میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو وضع قطع اور سج دھج میں اپنا امام بناتے ہیں ادھر سے جو لباس اور طور طریق ملتا ہے اسی کو اختیار کرنا ذریعہ عزت سمجھتے ہیں اگرچہ وہ لباس اور طرز اور طور طریق اللہ کے نزدیک لعنت ہی کا سبب ہو، اللہ تعالیٰ ہم کو سمجھ دے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر چلنے کی توفیق دے مردوں میں زنانہ پن کس کس طرح سے ہے اور عورتوں میں مردانہ پن کیسے کیسے آیا ہے اس کی تفصیلات لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ عموماً سب ان کو جانتے ہیں، البتہ یہ موٹی سی بات ہے کہ مرد کو ڈاڑھی مونڈنا حرام ہے اور عورتوں کو بے محابا منہ کھولے ہوئے بسوں میں سفر کرنا اور مردوں سے کھوے سے کھوا رگڑنا اور بازاروں میں بے پردہ ہوکر سامان خریدنا صرف ایک کرتی پہنکر باہر نکلنا یہ سب مردانہ پن ہے جو باعث لعنت ہے بہت سی عورتیں شرط لگاتی ہیں کہ ایسے مرد سے نکاح کریں گی جس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی ہو۔ اور بعض عورتیں اپنے شوہروں کی ڈاڑھی منڈوادیتی ہیں گویا ان کو ایسا شخص چاہئے جو ان لوگوں کی فہرست میں آتا ہو جن پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حدیث میں فرمایا ہے کہ عورت بننے والے مردوں اور مرد بننے والی عورتوں کو اپنے گھروں سے نکالدو، اس سے معلوم ہوا کہ ہیجڑے بنے ہوئے جو لوگ پھرتے رہتے ہیں، ان کو گھروں میں آنے کی اجازت دینا سخت منع ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضہ فرماتے ہیں کہ ایک ہیجڑہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی آپ نے فرمایا اس کو کیا ہوا؟ عرض کیا گیا کہ یہ عورتوں کی مشابہت اختیار کرتا ہے، آپ نے یہ سنکر مدینہ سے باہر نکلوادیا اور نقیع (جگہ) میں رہنے کو فرمایا (مشکوٰۃ شریف)

بعض گھروں میں بچہ کی پیدائش پر ہیجڑوں سے گانا گوایا جاتا ہے اس میں دہرا گناہ ہے ایک ان کو گھر میں گھسانا دوسرے گانا گوانا، اللہ تعالے ہر گناہ سے محفوظ رکھے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو عورتیں بے پردہ باہر پھرتی ہوں مسلمان عورت کو ان سے بھی پردہ کرنا لازم ہے۔

مولانا محمد رفیع عثمانی
استاذ دارالعلوم کراچی

آپ کے سوال ؟

اصولِ فقہ کا بانی ؟

بچوں کے رسالے "غنچہ" میں علم فقہ کا بانی عبداللہ بن مسعود رضہ کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے البلاغ (اپریل ۱۹٦٧ء) میں یہ لکھا دیکھا تھا کہ اصولِ فقہ پر سب سے پہلی کتاب امام شافعی رح نے لکھی ہے جس کا نام "الرسالۃ" ہے۔ ان میں سے کونسی بات صحیح ہے ؟

ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے، آپ کو تضادُ اس لئے معلوم ہوا کہ آپ "علم فقہ" اور "علم اصولِ فقہ" کو ایک چیز سمجھ رہے ہیں، حالانکہ یہ دو الگ الگ علم ہیں، "البلاغ" میں امام شافعی رح کو اصولِ فقہ کا بانی (مدقن اول) قرار دیا گیا ہے، علمِ فقہ کا نہیں، اور غنچہ میں عبداللہ بن مسعود رض کو علمِ فقہ کا بانی قرار دیا گیا ہے، اصولِ فقہ کا نہیں۔

سفید بالوں کا خضاب ؟

سفید بالوں کو خضاب کرنے کا کیا حکم ہے؟ کیا سرخ خضاب جائز اور سیاہ خضاب مکروہ یا حرام ہے ؟

گلزار احمد کلاچی، ترمن ضلع ڈیرہ غازی خان

سُرخ خضاب بالاتفاق جائز بلکہ مستحب ہے۔ اور سیاہ خضاب جہاد میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے بھی جائز ہے، باقی حالات میں سیاہ خضاب کرنا مکروہ تحریمی ہے[1]۔ البتہ دوسرے رنگوں مثلاً سُرخ، زرد یا سبز کا خضاب ہر حالت میں کیا جا سکتا ہے۔ فقہائے کرام نے یہ حکم مندرجۂ ذیل احادیث سے حاصل کیا ہے۔

(۱) عن جابرؓ قالَ اُتِیَ بابی قُحَافۃ یومِ فتحِ مکۃ ورأسُہٗ ولحیتُہٗ کالثغامۃ بیاضاً فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیروا ھذا الشیُٔ وَاجتَنِبُوا السوادَ۔
(مشکوٰۃ ص ۳۸۰ ج ۲ بحوالہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو قُحافہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد) کو فتح مکہ کے روز لایا گیا ان کا سر اور داڑھی بالکل سفید تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سفیدی کو کسی رنگ سے بدل دو مگر سیاہی سے پرہیز کرو

(۲) عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یکون قومٌ فی آخر الزمان یَخضِبُونَ بھذا السواد

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۲۰۳ تا ص ۲۱۰ ج ۴ طبع کراچی بحوالہ عالمگیری

لحوا صل الحمام لا یجدون رائحۃ الجنۃ (مشکوٰۃ ص ۳۸۲ بحوالہ ابوداؤد والنسائی)

وہ جنت کی ہوا بھی نہ پاسکیں گے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے سیاہ خضاب بھی کیا ہے، تو درا صل وہ جہاد کی حالت میں تھا، یا خالص سیاہ نہ تھا بلکہ سرخ مائل بسیاہی یا سبز مائل بہ سیاہی تھا جو جائز ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح و شدید ممانعت کی خلاف ورزی صحابۂ کرام کیسے کرسکتے ہیں۔

اسلامی سوشلزم؟

"براہ کرم اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر تبصرہ فرمایئے۔"

(سائل کا نام پڑھا نہیں گیا، ولیدابا حسین، گلری گراونڈ کراچی)

اس اصطلاح کو استعمال کرنے والوں نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد کو مانتے ہوئے اگر سوشلزم کا صرف اقتصادی نظام اپنا لیا جائے تو اُسے "اسلامی سوشلزم" کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اس خیال کی بنیاد اس غلط فہمی پر ہے کہ چونکہ سوشلزم بھی مساوات کا دعویٰ کرتا ہے اور اسلام بھی مساوات کا مدعی ہے، لہٰذا اسلام اور سوشلزم کا اختلاف صرف عقیدے کی حد تک تو ہے کہ سوشلزم خدا اور رسول اور یوم آخرت کا منکر ہے، اور اسلام کا سب سے پہلا سبق انہی تین چیزوں کا عقیدہ ہے ـــــــ رہا اقتصادی اور معاشی نظام تو اس میں اسلام اور سوشلزم کا کوئی اختلاف نہیں، لہٰذا اگر عقائد تو اسلام کے اور اقتصادی نظام اشتراکیت کا اپنا لیا جائے تو اس سے اسلام کے مقاصد پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی اور سوشلزم "مشرف بہ اسلام" ہو جائے گا۔

یہ نعرہ اگر کسی غیر ملکی سازش کا ترجمان نہیں تو بلاشبہ یہ اس مرعوب ذہنیت اور اسلام سے کھلی ناواقفیت کی پیداوار ضرور ہے جسے برصغیر کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ غلامی نے جنم دیا ہے۔

ورنہ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں ہے کہ سوشلزم کا اقتصادی نظام اسلام کے اقتصادی نظام سے بنیادی طور پر مختلف ہے یہ اقتصادیات کے بالکل الگ الگ دو نظام ہیں جن میں مطابقت کا کوئی امکان نہیں۔

سوشلزم جس مساوات کا مدعی ہے وہ نہ اسلام کا مقصود ہے، نہ اسلام اس کو صحیح سمجھتا ہے، سوشلزم معاشی مساوات کا مدعی ہے، جبکہ اسلام معاشی کی بجائے معاشرتی اور قانونی مساوات کا مدعی ہے۔ البتہ معاشیات میں اسلام توازن اور اعتدال کا ضامن ضرور ہے کہ اس میں کسی امیر کو غریب کا خون چوسنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

اسی طرح سوشلزم درحقیقت نظام سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کا جذباتی ردِ عمل ہے اور خود اتنا ہی سفاک بے رحم اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام۔ سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو ظالمانہ کھیل کھیلا جاتا ہے اس سے متأثر ہو کر سوشلزم کے جذباتی ناخداؤں نے انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کردیا، لیکن سوشلسٹ ممالک کی تاریخ اور موجودہ حالات شاہد ہیں کہ وہاں انفرادی ملکیت کے خاتمہ سے اس کے سوا کچھ نہ ہو سکا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار اسٹیٹ کے نام سے وجود میں آگیا جو سرمایہ کے پورے ذخیرہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے ـــــــ رہا بیچارہ مزدور تو وہ سوشلزم میں اس کی مظلومیت اور بڑھ گئی کہ یہاں اس کو یہ کہہ کر بیوقوف بنایا جاتا ہے کہ ہم نے تیرے درد کا درمان کردیا ہے لہٰذا تجھے کراہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔

اسلام کے نزدیک سرمایہ داری کی درندگی کا علاج

انفرادی ملکیت کا خاتمہ نہیں بلکہ انفرادی ملکیت کی خود غرضی، بے لگامی، اور غیر متوازن قوت کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام نے انفرادی ملکیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ محترم قرار دیا ہے، لیکن سود، قمار، سٹہ، احتکار، بیع الحاضر للبادی اور تلقی الجلب کی حرمت۔ اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر و خراج، وراثت، وصیت، وقف اور ہبہ کے مفصل احکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو اتنا پابند کر دیا ہے کہ مالدار کو کسی حال بھی غریب کے خون اور پسینے سے کھیلنے کا موقع نہیں ملتا۔

خلاصہ یہ کہ سوشلزم کے اقتصادی نظام کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو سرے سے تسلیم نہیں کرتا۔ پھر ان میں مصالحت کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس سے واضح ہو گیا کہ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح ایسی ہی مضحکہ خیز اور شرمناک ہے جیسے کوئی شخص برانڈی کی بوتل پر زمزم کا لیبل لگا کر دوسروں کو بے وقوف اور خود کو پارسا سمجھنے لگے۔ جس طرح عیسائیت، یہودیت اور ہندومت کبھی اسلامی نہیں ہو سکتی، اسی طرح نہ سوشلزم کبھی اسلامی ہو سکتا ہے اور نہ اسلام کبھی اشتراکی بن سکتا ہے۔ جس طرح اسلام کے نظام عبادات میں کسی دوسرے مذہب کی عبادات کا پیوند نہیں لگ سکتا، اسی طرح اس کے اقتصادی نظام میں بھی سرمایہ داری یا اشتراکیت کی پیوند کاری اسلام کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں۔

سوشلزم تو ابھی پچاس برس کی پیداوار ہے جس کا ابھی تک پورا تجربہ بھی کسی اشتراکی ملک میں نہیں ہو سکا، مگر اسلام کا اقتصادی نظام سیکڑوں برس تک مہذب دنیا میں کامیابی اور معتدل مساوات کے ساتھ رائج رہ چکا ہے اور جب تک مسلمانوں نے اسے اپنے بازاروں پر حکمران بنائے رکھا وہ دنیا کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔

پھر اسلام کو آخر کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی اقتصادیات کے لئے اشتراکیت کے جذباتی نظام کی سرمایہ داری کے عیارانہ نظام کی بھیک مانگتا پھرے۔

یاد رکھئے اگر بنی نوع انسان کی تقدیر میں پھر زندگی کی خوشحالیاں اور مسرتیں لکھی ہیں تو وہ صرف قرآن و سنت ہی کے اقتصادی نظام میں ملیں گی۔ داس کیپٹال (DAS CAPITAL) میں انھیں تلاش کرنا بد نصیبی اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش "مریز و کجدار" کی نمائش

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیے)

انوار السنن

ازافادات مولانا قاضی عبید اللہ صاحب نقشبندی؛ تالیف مولانا قاضی شمس الدین علوی، ناشر دار العلوم عبیدیہ بلاک ۳۲ ڈیرہ غازی خان ـ مغربی پاکستان۔ تقطیع ۲۰x۳۰/۸ صفحات ۲۴۰ قیمت ۵/۵۰

یہ احادیث نبوی کا ایک مجموعہ ہے جسے بلوغ المرام کے طرز پر ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جو فقہ حنفی کا مستدل ہیں۔ ہر حدیث کے آخر میں اس کا مأخذ لکھ دیا گیا ہے جن احادیث پر محدثین نے سنداً کلام کیا ہے ان کے ضعف یا صحت کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ ہر حدیث کے سامنے اس کا بامحاورہ اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کوشش قابل تعریف ہے اور اسے دینی مدارس ہدایہ اولین کے ساتھ داخل نصاب کرنا مفید ہوگا۔ (م۔ ت۔ ع)

قصص الاکابر

افاضات حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، ناشر کتب خانہ جمیلی ۵ گولڈنگ روڈ لاہور، سائز ۲۰x۳۰/۱۶ کے ۲۳۶ صفحات، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت معیاری، قیمت درج نہیں۔

اس کتاب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ وملفوظات سے ہندوستان کے معروف اولیائے عظام کے سبق آموز واقعات وحکایات کا انتخاب جمع کر دیا گیا ہے، مولانا شہاب الدین صاحب اس کے مرتب ہیں، اور حضرت کبیر الاولیاء سے لیکر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ تک مختلف بزرگوں کی حکایات الگ الگ اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے کتب خانہ جمیلی نے یہ کتاب نہایت سلیقے کے ساتھ شائع کی ہے جس پر وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ (م۔ ت۔ ع)

کتاب الصرف

مؤلفہ مولانا محمد مدنی صاحب؛ ملنے کا پتہ: محلہ کلاں کوٹ متصل گبول باغ کراچی ۱۲ چھوٹے سائز پر ۲۰۸ صفحات، کتابت وطباعت عمدہ، کاغذ رف، قیمت ساڑھے چار روپے۔

یہ اردو زبان میں عربی کے علم صرف پر ایک جامع کتاب ہے جس میں تمام ضروری گردانوں کے علاوہ تعلیلات کے قواعد خاصیات، ابواب اور اوزان کے بارے میں وہ تمام باتیں یکجا کر دی گئی ہیں جو عربی کے طالب علم کے لئے ضروری ہیں۔ اردو میں عربی کے علم صرف پر جامعیت کے لحاظ سے اس سے بہتر کتاب احقر کی نگاہ سے نہیں گذری، البتہ اگر اس کے ہر درس کے آخر میں کچھ مشقیں شامل کر دی جائیں تو یہ درس وتدریس کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید ہو سکے گی (م۔ ت۔ ع)

جذبات مجذوب ملقب بہ مراقبۂ موت

تصنیف:۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ امدادیہ جامع مسجد فیڈرل کیپٹل ایریا کراچی ۱۹ سائز ۲۰x۳۰/۱۶ ۱۶ صفحات قیمت گلیز ۲۰ پیسے، رف ۱۳ پیسے طباعت عکسی۔

اصلاح باطن اور صفائی قلب وروح کے لئے اہل اللہ اور رہنمایان تصوف رحمہم اللہ طالبین اور مریدین کو حسب حال مختلف اسباق تجویز فرماتے تھے منجملہ ان کے ایک سبق کا نام مراقبہ ہے، مراقبہ کسی خاص کیفیت کے استحضار کا

نام ہے۔ مراقبہ موت کا مطلب یہ ہے کہ طالب یکسو ہو کر موت کا استحضار کرے کہ وہ ایک دن ضرور آنی ہے، اور جب یہ استحضار ملکۂ راسخہ کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے تو دنیا اس کے لئے ہیچ ہو جاتی ہے۔ اس کے سارے اعمال و افعال کا محور عقبیٰ و آخرت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ خلق سے کٹ کر خالق سے جڑ جاتا ہے!

خواجہ عزیز الحسن رح نے جو حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ ارشد تھے۔ اس مراقبہ کو منظوم کر کے نہ صرف ایک خشک موضوع کو دلچسپ ہی بنا دیا ہے، بلکہ طالبین اصلاح کے لئے مراقبۂ موت کا استحضار سہل و آسان بھی بنا دیا ہے۔ (نعمانی)

حیات برزخ و قبور

مترجم :- مولانا حاجی احمد عبدالحلیم صاحب کانپوری مدظلہٗ۔

ملنے کا پتہ :- عوامی کتب خانہ بولٹن مارکیٹ کراچی ۲

$\frac{20 \times 30}{16}$ سائز، صفحات ۱۱۲، قیمت ۲۵/۱ کاغذ کتابت، طباعت معمولی

زیر تبصرہ کتاب جناب مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی کتاب "تذکرۃ الموتیٰ والقبور" کا ترجمہ ہے۔ اور قاضی صاحب موصوف کی یہ کتاب دراصل علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "شرح الصدور بشرح حال الموتیٰ والقبور" کے بعض ابواب کی تلخیص و اقتباسات کا فارسی ترجمہ ہے!

"قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوئے مراتب کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کے متعلق ان کے مرشد فرماتے ہیں کہ " خدا اگر مجھ سے پوچھے گا کہ کیا توشہ لائے ہو تو عرض کروں گا کہ ثناء اللہ کو لایا ہوں"!

رہے مترجم مدظلہٗ تو وہ ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، خود عالم باعمل اور بزرگان دین کے صحبت یافتہ اور تربیت دادہ ہیں اور صاحب تصنیف و تالیف!

کتب کے مضامین سے پورا استفادہ کرنے کے لئے تو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اجمالی آگاہی کے لئے ہم اس کے کچھ عنوان درج ذیل کرتے ہیں۔

۱- موت کی ابتدا کا بیان۔ (۲) موت مومن کا تحفہ ہے (۳) اچھے برے خاتمہ کی علامات۔ (۴) ملک الموت اور ان کے مددگار۔ (۵) شعبان کی پندرھویں شب دوران سال مرنے والوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ (۶) مردہ غسل و کفن دینے والے کو پہچانتا ہے (۷) نیکوں کے پڑوس میں دفن کا فائدہ (۸) فتنۂ قبر کا بیان (۹) جسے دفن نہ کیا جائے وہ بھی سوال و جواب سے بری نہیں۔ اور (۱۰) سوال کے وقت روح بدن میں لوٹا دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس ضروری اور مفید کتاب کو بار بار مطالعہ کرنے کی ہم اپنے قارئین سے توقع رکھتے ہیں، (نعمانی)

نفائس مرغوبہ فی حکم الدعا بعد المکتوبہ

مصنف :- مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ناشر :- مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء بندر روڈ کراچی

$\frac{20 \times 30}{16}$ سائز، صفحات ۱۲۸، قیمت ۲۵/۱ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ: حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ سے ایک سوال کیا گیا جس کے تین جز تھے۔

(۱) اجتماعی دعا صرف فرضوں کے بعد منقول ہے؟ یا

(۲) سنن و نوافل کے بعد بھی۔ اور

(۳) فرضوں کے بعد دعا کی مقدار۔

زیر تبصرہ کتاب میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے انہیں سوالات کا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا ہے، اور ثابت فرمایا ہے، کہ

(۱) سنن و نوافل کے بعد اجتماعی دعا، نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ صحابہ کرام رض سے نہ تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ سے۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف فرض نمازوں کے بعد دعا ثابت ہے۔

(۳) جن فرضوں کے بعد سنن و نوافل ہیں اس وقت مختصر دعا، ورنہ طویل دعا بھی جائز ہے۔ اس جواب پر ہندوستان بھر کے مشاہیر علماء کی تصدیقات ہیں، مولانا احمد رضا خاں صاحب کا فتویٰ بھی اس میں شامل ہے۔ اور اس کی تائید کرتا ہے جو کسی سائل کے جواب میں آپ نے دیا تھا۔

رسالہ کے تتمہ کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحریر بھی جو حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے بطور تائید شامل ہے۔

پھر ایک ضمیمہ ہے جس میں سب سے زائد مختلف مقامات کے علماء کبار کے فتاویٰ انہیں سوالات کے جوابات میں درج ہیں اور آخر میں مفتی مکہ معظمہ کا فتویٰ شامل ہے۔

کتاب کے آخر میں نفائس مرغوبہ کے جواب میں مفتی عبدالباری صاحب مرحوم کے رسالہ اللطائف المطبوعہ کا جواب بھی شامل ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

غرض اس موضوع پر منصف مزاج طالب حق حضرات کے لئے ان فتاویٰ کے بعد چون وچرا کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اہل علم کے لئے خصوصاً اور عامۃ المسلمین کے لئے عموماً اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (نعمانی)

جہاد اور اصلاح نفس

تالیف: حضرت مولانا محمد مسیح اللہ صاحب

ناشر:- ادارہ تجدیدات اشرفیہ اچھرہ اڈہ۔ لاہور ۲۰×۳۰/۱۶ سائز صفحات ۶۴ قیمت ۵،۷۵/- کاغذ کتابت طباعت معیاری۔

حضرت مولانا محمد مسیح اللہ صاحب مدظلہ، والا مناقب حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں۔

زیر تبصرہ رسالہ آپ ہی کی تالیف ہے، جس میں آپ نے جہاد کے مسائل و فضائل تحریر فرمانے کے ساتھ ساتھ حکیمانہ انداز میں اصلاح نفس کی طرف توجہ دلائی ہے۔

آخر میں اصلاح نفس کے عنوان سے آپ کے وہ ملفوظات درج ہیں جو آپ نے سکھر کی ایک مجلس میں ارشاد فرمائے اور جن کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کے خلیفہ مجاز مولانا عبدالحکیم صاحب ریواڑوی نے منضبط فرمایا۔

اہل اللہ کے ارشادات گرامی سے استفادہ کے شائق مسلمانوں کو اس کا مطالعہ انشاء اللہ نافع ہوگا۔

(نعمانی)

مخاطبات

از مولانا حکیم انجم فوقی بدایونی۔ ملنے کا پتہ جی ۴۹۴ ۵ کورنگی، کراچی

چھوٹے سائز کے ۳۲۱ صفحات، نیوز پرنٹ پر چھپے ہوئے قیمت تین روپے۔

جناب حکیم انجم فوقی بدایونی صاحب کے خطوط کا مجموعہ خطوط ادبی حیثیت سے قابل مطالعہ ہیں، مختصر جملوں میں وسیع معانی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جو بہت سی جگہوں پر کامیاب ہے، البتہ جہاں علمی مسائل زیر قلم آگئے ہیں وہاں سطحیت زیادہ ہے اور مغز کم

(م۔ ت۔ ع)

خزینۂ نعت

از بشیر زواری، ملنے کا پتہ: حاجی محمد بشیر اللہ ۳ے اے ایریا لیاقت آباد کراچی۔ چھوٹے سائز کے ۱۴۴ صفحات کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، قیمت تین روپے

یہ بشیر زواری صاحب کی نعتوں کا ایک مجموعہ ہے، عشق و محبت کے جن جذبات کے ساتھ یہ نعتیں کہی گئی ہیں وہ بیحد قابل قدر ہیں۔ شعری نقطۂ نظر سے بھی نعتیں گوارا ہی ہیں۔

(م۔ ت۔ ع)